ISSN 2321-4627

جنوری 2022ء

-/15 روپے

ماہنامہ قومی زبان حیدرآباد

تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی کا علمی، ادبی، لسانی، فنی، تہذیبی جریدہ

QAUMI ZABAN Monthly, Hyderabad

حضرت امجد حیدرآبادیؒ

منشی نول کشور

مولانا حسرت موہانیؒ

جناب کوپولہ ایشور عزت مآب وزیر برائے درج فہرست طبقات' اقلیتی بہبود' بہبودی معمرین و معزورین حکومت تلنگانہ کے ہاتھوں تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی کے
زیر اہتمام شائع شدہ اردو میڈیم گراجویشن کی نصابی کتابوں کی ریاست کے ڈگری کالجس کو مفت سربراہی عمل میں لائی گئی' اس موقع پر منعقدہ تقریب سے
وزیر موصوف خطاب کرتے ہوئے۔ تصویر میں ڈاکٹر محمد غوث ڈائرکٹر / سکریٹری تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی' مسٹر وی۔ کرشنا سپرنٹنڈنٹ اردو اکیڈیمی' آئی ٹی کمپنی کے
جناب عرفان عزیز' عہدیداران وارکین عملہ محمد عطاءاللہ خان' احمد بن اسحاق' محمد ارشد مبین زبیری' محمد جنید اللہ بیگ' رجب علی پاشاہ و دیگر معززین دیکھے جاسکتے ہیں

جناب کوپولہ ایشور عزت مآب وزیر برائے درج فہرست طبقات' اقلیتی بہبود' بہبودی معمرین و معزورین حکومت تلنگانہ کے ہاتھوں تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی کے
زیر اہتمام اردو میڈیم گراجویشن کی نصابی کتابوں کی ریاست کے ڈگری کالجس کو مفت سربراہی عمل میں لائی گئی' اس موقع پر لی گئی تصویر میں ڈاکٹر محمد غوث ڈائرکٹر /
سکریٹری تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی' جناب محمد عبدالقدوس اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو حسینی علم ڈگری کالج برائے اناث' مسٹر وی۔ کرشنا سپرنٹنڈنٹ اردو اکیڈیمی'
عہدیداران وارکین عملہ اردو اکیڈیمی محمد عطاءاللہ خان' محمد جنید اللہ بیگ' رجب علی پاشاہ و دیگر معززین دیکھے جاسکتے ہیں

اقلیتوں کے قومی کمیشن' وزارت اقلیتی امور حکومت ہند کی رکن محترمہ سید شہزادی نے حیدرآ د میں محکمہ اقلیتی بہبود حکومت تلنگانہ کے عہد اروں سے مشاورتی اجلاس میں شر کی۔
اس موقع پ لی گئی تصو میں جناب احمد یم سکریٹری ٹو گورنمنٹ محکمہ اقلیتی بہبود حکومت تلنگانہ' جناب بی۔ شفیع اللہ سکریٹری تلنگانہ اقلیتی تعلیمی ادارہ جات سوسائٹی' محترمہ کا ویسلی
ایم ڈی ریستی اقلیتی مالیاتی کارپور ' جناب محمد لیاقت علی جائنٹ سکریٹری ٹمریز' جناب پ وی انجینئر' جناب دلاور' مسٹر دھنراج' جناب محمد سمیع اللہ سینئر اسسٹنٹ اقلیتی بہبود'
مسٹر وی۔ کرشنا سپرنٹنڈنٹ اردو اکیڈیمی ود اصحاب دیکھے جا ہیں

www.urduacademyts.com

قرینہ

ہم کلامی	ڈاکٹر محمد غوث	4

یادرفتگاں

داستانِ طغیانی رود موسیٰ ۱۳۲۶ھ 1908ء ''عظیم تباہی'' حضرت امجد حیدرآبادیؒ کی زبانی		5
اُردو رباعی کا مجدِ امجدؔ	ڈاکٹر محمد اکمل خان	11
منشی نول کشور۔ علمی، ادبی اور سماجی خدمات	ڈاکٹر رنجیت بھارگوا	20
حسرتؔ کی غزل: شورشِ عشق کا قلبی تموّج	ڈاکٹر محبوب ثاقب	23

مضامین

طلباء کی تعلیمی تحصیل اور ہم نصابی سرگرمیوں کی اہمیت	ڈاکٹر روبینہ / پروفیسر صدیقی محمد محمود	32
نئی قومی تعلیمی پالیسی : ایک غیر جانبدار جائزہ	خواجہ کوثر حیات	38
آزادی سے پہلے حیدرآباد کے نقاد اور ان کی تنقیدی خدمات	نظیر احمد گنائی	42
اکیسویں صدی میں اساتذہ کی تدریس میں آئی۔سی۔ٹی کا کردار	ڈاکٹر صحیفہ سلطانہ	50
سرزمین دولت آباد کی اولین دکنی مثنویاں	فہیم الدین	53
ناول ''سلام دین کا ہاؤس بوٹ'' کا سماجی المیہ	مختار احمد	57
ناول کی صنف اور فن	برکت صدیقہ	62
تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی کی ویب سائٹ۔ایک جائزہ	محمد محبوب	68

افسانہ

رشتے	دیپک کنول	73

حصہ نظم

غزلیں	صلاح الدین نیّر	80
	جلال عارفؔ	
	صابر کاغذنگری	81
	ڈاکٹر معید جاویدؔ	
	جہانگیر قیاسؔ	82
	فرید سحرؔ	

oOo

ماہنامہ قومی زبان حیدرآباد

تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی کا علمی، ادبی، لسانی، فنی و تنقیدی جریدہ

QAUMI ZABAN Monthly, Hyderabad.

جلد : 07 شمارہ : 01 جنوری 2022ء

ایڈیٹر

ڈاکٹر محمد غوث

ڈائریکٹر/سکریٹری تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی

ناشر و طابع

تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی

چوتھی منزل، حج ہاؤز، نامپلی

حیدرآباد-001 500 (تلنگانہ)

مقام اشاعت : تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی

ترتیب وتزئین : محمد ارشد مبین زبیری

کمپوزنگ، ڈیزائننگ : محمد اعظم علی

قیمت -/15 روپے سالانہ -/150 روپے

Total Pages : 84

قومی زبان کی خریداری کے لیے چیک ڈرافٹ یا منی آرڈر بنام ڈائرکٹر/سکریٹری تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی روانہ کریں اور وضاحت طلب امور کے لیے وہیں رابطہ فرمائیں۔

☆

''قومی زبان'' میں شائع شدہ مضامین میں اظہار کردہ خیالات سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

☆

Printed by Dr. Mohammed Ghouse and Published by Mohammed Ghouse on behalf of Telangana State Urdu Academy, Minorities Welfare Dept.,Govt.of Telangana, Printed at M/s. Taha Enterprises, Printing and Packaging, 11-6-833, Red Hills, Lakdi ka Pul, Hyderabad-500004, T.S..

Published at 4th Floor, Haj House, Nampally, Hyderabad-500 001 Telangana State.
Ph: No. 040-23237810 Fax: 040-66362931
Email: qaumizaban.tsua2015@gmail.com
website : urduacademyts.com

www.urduacademyts.com

ہم کلامی

قارئین قومی زبان' محبان اردو اور عوام الناس کو نیا سال 2022ء مبارک۔ ماہنامہ قومی زبان کے ماہ جنوری 2022 کے شمارے کی ابتداء یادرفتگاں کے تحت شہنشاہ رباعی حضرت امجد حیدر آبادی کے مضمون "داستانِ طغیانی رود موسیٰ ۱۳۲۶ھ (1908)ء "عظیم تباہی" حضرت امجد حیدر آبادیؒ کی زبانی" کے عنوان سے کی گئی ہے' اس کے بعد "اُردو رباعی کا جد امجد" کے عنوان سے امجد حیدر آبادی کے فن پر ڈاکٹر محمد اکمل خان کا مضمون' اس کے ساتھ ہی علم وادب کی ایک اور نامور شخصیت منشی نول کشور پر ڈاکٹر رنجیت بھارگوا کی تحریر اور عظیم مجاہد آزادی ہند حسرت موہانی پر ڈاکٹر محبوب ثاقب کا مضمون' اسی طرح مضامین میں طلباء کی تعلیمی تحصیل اور ہم نصابی سرگرمیوں کی اہمیت پر ڈاکٹر روبینہ اور پروفیسر صدیقی محمود کا مشترکہ مضمون "نئی قومی تعلیمی پالیسی ایک غیر جانبدار جائزہ" کے عنوان سے خواجہ کوثر حیات کا مضمون' آزادی سے پہلے حیدر آباد کے نقاد اور ان کی تنقیدی خدمات" کے عنوان سے نظیر احمد گنائی کی تحریر' ریسرچ اسکالرس فہیم الدین' مختار احمد' برکت صدیقہ کے مضامین ومقالے اور تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی کی ویب سائٹ پر ریسرچ اسکالر محمد محبوب کا مضمون شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ممتاز افسانہ نگار دیپک کنول کا کلاسیکل افسانہ "رشتے" اور حسب معمول حصہ نظم میں ممتاز شعرائے کرام جناب صلاح الدین نیّر' جناب جلال عارف' جناب صابر کاغذنگری' ڈاکٹر معید جاوید' جناب فرید سحر اور جناب جہانگیر قیاس کا کلام شائع کیا گیا ہے۔ امید کہ یہ نگارشات قارئین کے ذوق کے مطابق ہوں گی اور ان کی دلچسپیوں کا سامان فراہم کریں گی۔

تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی نے گذرے ہوئے سال میں فروغ اردو کے سلسلہ میں کئی اہم کام انجام دیے ہیں جن میں اردو میڈیم گرائجویشن کی سال اول دوم اور سوم کی سیاسیات' معاشیات اور تاریخ کی 9 نصابی کتابوں کی اشاعت' اردو اساتذہ' اردو اسکالرس وصحافیوں کی آن لائن تربیت کے پروگرامس' مختصر مدتی اردو بنیادی کورس اور مختصر مدتی عروض دانی کورس قابل ذکر ہیں۔ علاوہ ازیں اُردو اکیڈیمی نے ماہنامہ قومی زبان وبچوں کے رسالے "روشن ستارے" کی رکنیت سازی مہم' فروغ اردو کے سلسلہ میں سمینارس و مشاعرے وغیرہ بھی منعقد کئے۔ اسی طرح اردو اکیڈیمی کی 7 اسکیمات جن میں الیکٹرانک میڈیا کے رپورٹرس کو مالی اعانت برائے سال 22-2021' اردو کے چھوٹے اخبارات کی مالی اعانت برائے سال 22-2021' اُردو مصنفین کی کتابوں کی اشاعت کے لئے جزوی مالی اعانت برائے سال 2020' اردو کی مطبوعات پر انعامات برائے سال 2019 اور 2020' بیسٹ اردو ٹیچر ایوارڈ برائے سال 20-2019 اور 21-2020 اور اُردو کی مجموعی خدمات پر "کارنامہ حیات ایوارڈ" برائے سال 2018' 2019 اور 2020' شامل ہیں' ان اسکیمات کے لئے آن لائن درخواستیں قبول کی جارہی ہیں' اس سلسلہ میں آخری تاریخ 15 جنوری 2022 رکھی گئی تھی' اس خصوص میں تاحال 600 سے زائد درخواستیں آن لائن وصول ہوچکی ہیں اور ساری ریاست سے آن لائن درخواستوں کے طریقہ کار کی پذیرائی ہورہی ہے اور اردو ادبا' شعراء' اسکالرس' قلم کاروں اور اردو تنظیموں کی جانب سے آخری تاریخ میں مزید توسیع کی نمائندگیوں پر آخری تاریخ میں 31/ جنوری 2022ء تک توسیع کردی گئی ہے۔ ان اسکیمات کے علحدہ علحدہ لنکس تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی کی ویب سائٹ www.urduacademyts.com پر دستیاب ہیں۔ تمام اسکیمات کے لئے درخواست گذار اپنی اپنی متعلقہ لنکس کے ذریعہ 31 جنوری 2022ء تک درخواستیں آن لائن داخل کرسکتے ہیں۔ تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی' مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی' سیٹ ون اور دیگر اداروں کے اشتراک سے ریاست تلنگانہ میں پہلی بار اردو ذریعہ تعلیم سے فارغ طلباء وطالبات کے لئے جاب میلہ بھی 6/ جنوری 2022ء کو منعقد ہونے والا تھا' لیکن موجودہ کرونا وبا کے پس منظر میں حکومت کی تحدیدات کی وجہ سے یہ پروگرام ملتوی کردیا گیا' جیسے ہی حالات سازگار ہوں گے' اس جاب میلے کی نئی تاریخ کا اعلان کیا جائے گا۔ بہرحال ہماری کوشش رہے گی کہ فروغ اردو کی تمام اسکیمات کو اپنے وقت پر تکمیل کو پہنچایا جائے۔

محبانِ اُردو' دانشوران ملت' اسکالرس واساتذہ سے درخواست ہے کہ وہ اس جریدہ میں قوم وملت کے مسائل پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنے تحقیقی مقالے' سائنسی دلائل کے ذریعہ اپنی تخلیقات روانہ فرمائیں۔ معاشرہ اور ملت کے سنگین مسائل' ان کے حل وامکانات کا بھرپور جائزہ لیں۔ مسائل پر روشنی صرف بیداری پیدا کرتی ہے جب کہ ان کا حل مجموعی حیثیت سے مثبت ماحول پیدا کرے گا۔

آیئے عہد کریں کہ مادری زبان اُردو کی حفاظت' فروغ اور ترقی میں ہمارا انفرادی اور اجتماعی حصہ ہو' اس لئے کہ عوامی شراکت اور مہذب معاشرے کی انجمنوں کی مستعدی کے بغیر تہذیب وثقافت کی بقا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ آیئے ہم سب مل کر بہتر سرگرمیوں کی پذیرائی کریں اور مثبت کاموں میں باہمی اشتراک کے ذریعہ اردو اکیڈیمی کے ساتھ دست تعاون دراز کریں گے۔

محمد غوث

ڈاکٹر محمد غوث
ایڈیٹر

www.urduacademyts.com

داستانِ طغیانی رودموسیٰ ۱۳۲۶ھ 1908ء "عظیم تباہی"

حضرت امجد حیدرآبادیؒ کی زبانی

کسی عظیم تباہی کی آمد آمد میں
زمین گھومتی ہے ہولناک محور پر
نفس کی آمد و شد ہے فنا کے جھونکوں میں
حباب تیرتے ہیں موجزن سمندر پر

ہمارا مکان ندی سے کوئی ساٹھ گز کے فاصلہ پر واقع تھا۔ سلخ شعبان ۱۳۲۶ھ کی شام ہی سے رودموسیٰ لبریز ہوکر اپنے دونوں ساحلوں کی طرف سیل بلا کی طرح بڑھ آیا۔ ہم نے اس وقت والدہ سے چلنے کے لئے کہا بھی مگر انھوں نے کمال استقامت سے یہی جواب دیا کہ موت جب آہی گئی ہے تو یہاں اور وہاں سب برابر ہے۔ اَیْنَمَا تَکُوْنُوا یُدْرِکْکُمُ الْمُوتُ.

رات کے دس بجے تک تو بڑھتے ہوئی پانی نے غنیم کی فوج کی طرح چاروں طرف سے محاصرہ کرلیا' اس وقت ہم سب لوگ گھبرا کر پاس کے مکان میں جو نہایت مرتفع اور مستحکم تھا اور پہلے بھی ایک بار ندی کے حملے سے بچ چکا تھا' چلے گئے۔ یہاں ہم سے پہلے ہی محلّہ کے اکثر لوگ پناہ لینے کے لئے آگئے تھے۔ ہم مکان کے دیوان خانے میں ٹھیر گئے تھوڑی ہی دیر میں قبلہ رُخ کی دیوار شق ہوئی۔ کمرے کے ہال میں پانی دراتا ہوا گھس آیا۔ ہم اُدھر سے بھاگ کر دوسری طرف جا بیٹھے۔ اُدھر بھی دم لینے نہ پائے تھے کہ صحن کا پانی دروازے کے راستہ چڑھتا ہوا اوپر آگیا۔ آخر ایک تخت بیچ میں ڈال کر ہم سب اس پر بیٹھ گئے۔

عزیز ناظرین! ہمارے لئے یہ بہت نازک وقت تھا۔ دونوں طرف پانی برابر چڑھتا اُترتا آرہا تھا' نہ اِدھر کوئی راستہ' نہ اُدھر کوئی مفر۔ اِدھر موت' اُدھر ملک الموت۔

ہم نے سب سے کہدیا کہ اپنے اپنے گناہوں سے توبہ واستغفار کرلو ایک دوسرے سے معافی چاہ لو۔ اچھی طرح گلے مل لو۔ چھت اب گری کہ جب گری۔

ہم اس وقت آنکھیں بند کئے' دونوں ہاتھ سے سر پکڑے چھت گرنے اور مرنے کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس تمام طوفانی حادثہ میں یہ وقت ہمارے لئے کمال کرب کا وقت تھا۔ اس اضطراب میں یکا یک اک ہوک اٹھی۔ جی میں آئی جب مرنا ہی ہے تو چھت کے نیچے دب کر اور چورا چورا ہوکر کیوں مریں' میدان میں نکل کر کیوں نہ جان دیں۔

خیال نے عزم' عزم نے فعلیت کی صورت اختیار

www.urduacademyts.com

کرلی۔ فوراً ماں کا ہاتھ پکڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ماں کے ساتھ بیوی' بیوی کی گود میں بچی' چار سربکف مجاہدین کا قافلہ شق شدہ دیوار کی درز سے قبلہ رُخ گلی میں اترنے کے لئے تیار ہوگیا۔ میر قافلہ نے پہلے قدم رکھا اور یہ سمجھ کر کہ پانی میں اتر رہے ہیں مگر ایسا نہیں ہوا بلکہ ہمارا قدم ایک گرے ہوئے مکان کے ملبے پر پڑا۔ ہمارے بعد والدہ اور بیوی بھی مکان سے باہر ہوکر ملبے پر کھڑی ہوگئیں۔ اِدھر ہم باہر ہوئے اُدھر چھت بیٹھ گئی' گھبرا کر آگے بڑھ گئے' خدا کی قدرت صدہا مکانوں کے گرنے سے ملبے کے بڑے بڑے پشتے قائم ہوگئے تھے' جو اونچائی میں ان مکانوں کے برابر تھے جو ابھی گرے نہ تھے۔

اندھیری رات میں پانی کے اندر ہی اندر پاؤں سے راستہ ٹٹولتے ملبوں پر پاؤں رکھتے کودتے پھاندتے جانب جنوب ایک مثلث وضع چبوترے تک پہنچ گئے۔

اب آگے کوئی ملبہ یا پشتہ نہ ملا۔ وہیں ٹھٹک کر رہ گئے۔ اس وقت ندی ملبوں اچھل رہی تھی۔ پانی لحظہ بہ لحظہ بڑھتا ہی جا رہا تھا' چاروں طرف اندھیرا گھپ چھایا ہوا تھا۔ مینھ لگاتار برس رہا تھا' موجوں کے شور اور گرتے ہوئے مکانوں کے دھماکے سے جو کبھی بجلی کی کڑک کبھی توپوں کی گرج کے مشابہ تھا' دل سینے میں دہل دہل کر رہ جاتا تھا۔

جب ہم اس چبوترے پر آئے تھے' پانی اس کی منڈیر سے نیچے تھا۔ لیکن جوں جوں ندی چڑھتی گئی' چبوترے سے پانی اونچا ہوتا چلا۔ رات کے دو بجے تک تو پانی چبوترے سے چڑھتا ہوا پاؤں سے ٹخنوں' ٹخنوں سے پنڈیوں' پنڈلیوں سے گھٹنوں' گھٹنوں سے کمر' کمر سے گلے تک آپہنچا۔ ہم لوگ اس خیال سے کہ بہیں تو ایک ساتھ بہیں' ڈوبیں تو ایک ساتھ ڈوبیں' ایک دوسرے کے ہاتھ مضبوطی سے تھام کر ڈوبنے سے بچنے کے لئے چبوترے سے آگے بڑھے۔ چبوترے سے آگے بڑھنا ہی تھا کہ سب کے سب غڑاپ سے پانی میں ڈوب گئے۔ ڈر کر کھائی سے جا پڑے قندق میں۔

ہم ایک طرف' ماں ایک طرف' بیوی ایک طرف' بچی ایک طرف' مجتمعہ عناصر ار بو منتشر ہوگئے۔ اس جگہ بھی قدرت کا کرشمہ دیکھنے کے قابل ہے' ہمارا قدم ڈوبنے کے بعد زمین کی سطح کی جگہ گھاس کے چھپر پر جا پڑا۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔

یہاں تو لاکھوں تنکوں کا ایک پورا چھپر مل گیا' ہم چھپر کے ذریعہ خود بخود پھر سطح آب پر برآمد ہوگئے۔ والدہ' بیوی' بچی ہمارے قریب ہی غوطے کھا رہی تھیں۔ یکے بعد دیگر ہر ایک کو پانی سے نکال نکال کر چھپر پر چڑھا لیا۔ چھپر چار آدمیوں کے بوجھ پر بھی سطح آب پر برابر قائم رہا۔ ہم بچی کو جو حیرتناک تحمل سے ہمارے ساتھ مصیبتوں کو برداشت کرنے

www.urduacademyts.com

میں شریک تھی' جو ذرا ذرا سی بات پر رونے والی آج بالکل ساکت وصامت تھی' کاندھے پر ڈالے ہوئے آنے والے وقت کا انتظار کررہے تھے۔

اسی طرح کچھ وقت اسی چھپر پر بھی گزر گیا مگر کس طرح گزرا۔

سینہ شبگا فم اگر طاقت دیدن داری

یہاں تک کہ صبح کا ذب نمودار ہوگئی۔ دور دور کی مسجدوں سے اللہ اکبر کی آواز آنے لگی۔

ہم سمجھے کہ اندھیری رات تو جوں توں کٹ گئی۔ اب صبح ہو چلی ہے۔ دن کے اُجالے میں کوئی نہ کوئی بچاؤ کی صورت نکل ہی آئے گی۔ یہ نہ سمجھے کہ دن کی روشنی رات کی ظلمت سے زیادہ ظالم ثابت ہوگی۔

اس ہولناک بیداری سے رات کا متوحش خواب ہی غنیمت رہے گا یعنی صبح کے وقت ندی کی زد سے فصیل شہر کا ایک حصہ گر پڑا۔ فصیل گرنے کی وجہ سے اس کا سمٹا ہوا زور دور دور پھیل کر ہماری طرف بھی منتقل ہوگیا۔ اب تک پانی میں صرف بڑھاؤ تھا بہاؤ نہ تھا۔ مگر فصیل گرنے کے بعد پانی اپنی اصلیت (یعنی روانی) پر آ گیا' اور ہمارا چھپر جس پر ہم اب تک جان مٹھی پر میں لئے بیٹھے ہوئے تھے۔ طوفانی کشتی کی طرح ڈگمگانے لگا بچی ابا ابا کہہ کر گلے سے لپٹ گئی۔ ہم نے اس معصوم سے کہا! بیٹی رو نہیں سوجا' ہمیشہ کے لئے سوجا' ہمارے ہوش وحواس اس وقت بھی قابل تعریف تھے کہ ہم نے بیوی سے مہر معاف کرالیا' اور ماں کے قدموں پر سر جھکا کر اپنی گزشتہ نافرمانیوں وغیرہ کی معافی مانگ لی' اب چھپر آہستہ آہستہ دھارے کے ساتھ سطح آب پر بہنے لگا' جانیں جسموں سے نکلنے کے قریب ہوگئیں۔ ماں نے گھبرا کر پوچھا بیٹا! اب کیا کرنا چاہئے؟ ہم نے کہا اگر کوئی بڑا اور چوڑا تختہ مل جاتا تو اس پر بیٹھ کر بہتے ہوئے چلے جاتے۔ پھر آگے جو پیش آئے اس کہنے کے ساتھ ہی والدہ نے ایک تختہ کی طرف اشارہ کیا جو بہتا ہوا ہماری ہی طرف آرہا تھا جب بالکل ہی قریب آگیا۔ ہم تختہ کے شوق میں بغیر اس خیال کے کہ بچی کاندھے پر بیٹھی ہوئی ہے پانی میں کود پڑے۔ والدہ نے بچی کو تو فوراً اٹھالیا ہم تختہ کی طرف بڑھے چلے گئے تختہ لانے کو چلے تھے پانی کا دھارا ہم کو بہالے چلا۔

تقدیر میں جب تک ماں بیوی کا ساتھ دینا لکھا تھا ساتھ دے چکے' اب ماں دیکھ رہی ہے بیٹا بہا چلا جارہا ہے اور جانا بھی کیا جیسے کڑی کمان سے تیر نکلتا ہے۔ یہاں تک کہ بہتے بہتے ایک درخت کے قریب پہنچ کر اس کی جھکی ہوئی ڈالی پکڑ لی اور ساتھ ہی پلٹ کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ ہم اس وقت اپنے ساتھیوں سے تقریباً سو گز دور ہوگئے تھے۔

ہم نے وہیں سے چلا کر آواز دی کہ بچی کو کسی بہتے

www.urduacademyts.com

ہوئے صندوق میں بند کر کے بہادو، ممکن ہوتو میں اس طرف سے نکال لوں گا اور تم بھی کسی تختے وغیرہ کا سہارا لے کر اپنے آپ کو دریا کی موجوں کے حوالے کردو۔

حضرت کن فیکون کے تماشے دیکھتے جایئے۔ اس کہنے کے بعد ہی والدہ کے سامنے مختلف سامانوں کے ٹین کا ایک بڑا صندوق بھی بہتا ہوا آ گیا' والدہ نے اس کو پکڑ بھی لیا۔

اور چاہا کہ موسیٰ علیہ السلام کی طرح بچی کو صندوق میں بند کر کے بہادیں' مگر قسمت کی بات صندوق مقفل نکلا۔ والدہ نے مایوسی کے ساتھ پھر مجھے پکار کر کیا' بیٹا! صندوق کو قفل لگا ہے۔ پھر صندوق کو چھوڑ کر ایک بڑی شہتیر پکڑ لی اور اپنی بہو کو بھی اس کے تھام لینے کی ہدایت کر کے اپنے آپ کو دریا کے حوالہ کر دیا۔ یہ ہولناک راستہ چند قدم ہی طے ہوا تھا کہ بیوی کے ہاتھ سے شہتیر نکل گئی پھر پتہ نہ چلا کہ کیا ہوئیں۔

تھوڑی دیر کے بعد والدہ بھی نہ سنبھل سکیں۔ شہتیر سے دور جا پڑیں۔ کبھی ڈوبتی ہیں' کبھی اچھلتی ہیں کبھی صرف سر کے بال نظر آتے ہیں' کبھی زور کر کے اُبھرتی ہیں تو کچھ صورت بھی نظر آجاتی ہے مگر پلک جھپکنے تک پھر ڈوب جاتی ہیں۔ آہ! آہ! ان تمام طوفانی مناظر میں یہ منظر جو کچھ تھا۔ اس کا اندازہ ہمارے سوائے شاید ہی کوئی کر سکے۔

ہم درخت سے یہ سب حالات دیکھ رہے' ہر وقت قصد ہوتا ہے کہ پانی میں کود پڑوں' ماں تک پہنچ جاؤں۔ مگر دھارے کی مخالف سمت کچھ زور نہیں چل سکتا۔

خدا کی قدرت والدہ خود بخود بہتی ہوئی ایک درخت کے قریب پہنچ گئیں جو ہم سے تھوڑی ہی فاصلہ پر تھا' ہم نے فوراً آواز دی ماں! تم درخت تک پہنچ گئی ہو تمہارے سر پر ڈالیاں جھکی ہوئی ہیں فوراً کسی ڈالی کو پکڑ لو۔

ماں نے بیٹے کی آواز سن لی' اسی عالم بدحواسی میں ہاتھ بڑھا کر ایک پتلی سی ڈالی پکڑ لی اور ہماری طرف دیکھ کر کہا۔ ہائے بیٹا میرے دونوں چاند ڈوب گئے (یعنی بہو اور پوتی) ہم نے کہا خیر جو ہوا ہوا تم کسی طرح بچ جاؤ۔

ماں نے کہا بچی کمر سے بندھی ہوئی ہے جو پانی میں لٹک گئی ہے جس کی وجہ سے میں اوپر ابھر نہیں سکتی۔ ہماری والدہ کی یہی ایک آخری بات تھی جو ہمارے کانوں تک پہنچی۔

اب معلوم ہوا کہ والدہ نے اپنا ڈوپٹہ نکال کر نصف اپنی اور نصف بچی کی کمر سے باندھ لیا تھا کہ بچی کہیں ہاتھ سے نہ چھوٹ جائے۔ انھوں نے بچی کی جان بچانی چاہی' بچی پتھر بن کر ان کو ڈبو رہی ہے' اب تک تو وہ بچی کو نہیں چھوڑ نا چاہتے تھے' اب بچی ان کو نہیں چھوڑ نا چاہتی۔ ہماری شان بھی اس وقت تصویر لینے کے قابل تھی۔

جس درخت پر ہم چڑھے ہوئے تھے اس کو ایک

www.urduacademyts.com

لمبی ڈالی کے سوائے جو بہت اونچی چلی گئی تھی کوئی اور ٹہنی یا ڈالی نہ تھی جس سے ہماری طرح کئی سانپ اور کنکھجورے لپٹے ہوئے تھے۔ ہم اس وقت اس ڈالی پر تکیہ کئے ہوئے اپنی ماں سے گفتگو کر رہے تھے۔

والدہ کی مذکورالصدر آخری بات سننے کے بعد وہ ڈالی جو ہماری پشتیبان تھی تڑ سے ٹوٹ گئی' ہم الٹ کر پانی میں گرے۔ گر کر پھر جو ابھرے بے ساختہ ہماری زبان سے نکل گیا ''اماں میں تو چلا'' کاش ہماری زبان بند ہو جاتی' ہمارا حلق بیٹھ جاتا۔ کیونکہ اس آواز کے ساتھ ہی گھبرا کر انھوں نے ہماری طرف دیکھا اور وہ پتلی سے ڈالی بھی ہاتھ سے چھوٹ گئی' ماں کے دو چاندوں کی طرح ہمارا ایک چاند بھی پانی میں ہمیشہ کے لئے ڈوب گیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

طاقت نہیں دست و پا میں بے زور ہوں میں
پامالِ زمانہ صورت مور ہوں میں
اماں! نہ سمجھنا کہ جہاں میں خوش ہوں
تم ہو بے گور زندہ درگور ہوں میں

ہم ننگ خاندان' خاندان کو ڈبو کر ڈوبتے تیرتے ندی کے زبردست دھارے میں بہے چلے جا رہے تھے۔ دور سے اس قسم کی دو دھاریں نظر آئیں۔ سیدھے خط کی زبردست دھار بخط مستقیم نئے پل میں پہنچ کر ہر بہنے کو ٹھیک موت کے گھاٹ اتار رہی تھی۔ دوسری کمائی شکل کی کمزور دھار زنانہ ہسپتال کے جنوبی جانب سے ہوتی ہوئی نئے پل تک جا رہی تھی۔ ہم بہتے بہتے ان دونوں دھاروں کو دیکھتے اور سوچتے جا رہے تھے اگر سیدھے خط میں جا پڑیں تو ٹھیک موت کے منہ میں پہنچ جائیں گے۔ اگر دوسری کمانی دھار سے گزرتے ہیں تو کچھ نہ کچھ بچنے کی امید ہو سکتی ہے مگر دونوں صورتیں اپنے اختیار سے باہر اور امکان سے دور تھیں۔ بارہ گھنٹے پانی میں رہتے غوطے کھاتے کھاتے ہاتھ پاؤں شل ہو گئے تھے۔

جسم کی تمام طاقت بھی دریا برد ہو گئی تھی۔ اسی سوچ سوچ میں بجلی کی رفتار سے محل تقاطع لا تک پہنچ گئے اور وہی ہوا جس کا کھٹکا لگا ہوا تھا یعنی سیدھی دھار میں بہتے چلے۔ موت کا یقین قطعی ہو گیا تھا۔ انا للہ کہہ کر آنکھیں بند کر لیں۔ ایسے وقت میں خیال آیا کہ نہ معلوم ہماری لاش کدھر بہے۔ کہاں نکلے' کون نکالے۔ ہمارے ویسٹ کوٹ کی جیب میں پاکٹ ہے۔ پاکٹ میں کچھ روپیہ ہے۔ ہم سے مرنے والے کو روپیہ جیب میں رکھ کر مرنا بڑی شرمناک بات ہے۔ لوگ ہماری جیب ٹٹولیں گے روپیہ نکالیں گے۔ ہماری خساست پر نفرت کے ساتھ لعن طعن کریں گے۔

یہ خیال لفظوں میں بہت دیر میں ادا کیا گیا مگر تصور میں ایک بجلی کی چمک سے زیادہ وقفہ نہ ہوا۔ خیال کے ساتھ ہی جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا' پاکٹ بھی کچھ جیب سے نکلی

www.urduacademyts.com

ہوئی گویا نکلنے کو تیار ہی بیٹھی ہوئی تھی' فوراً ہاتھ آ گئی۔ چھوٹی سی سیاہ پاکٹ کو ہاتھ میں لے کر اس زور اور نفرت سے پانی میں پھینکا جس طرح کوئی طاعونی چوہے کو پھنکتا ہو۔ بچانے والا پاکٹ اندازی کی آڑ میں سب کچھ کر گیا' بظاہر ہم اپنے اسی زور کی زد سے اس خوفناک دھار سے نکل کر دوسری کمزور دھار میں آ پڑے اور اسی دھار میں کچھ دور بہنے اور زنانہ ہسپتال کے محاذ میں آنے کے بعد ہسپتال کی بیمار عورتوں نے ہمت کر کے ڈوبتے کو بچالیا۔ دریا نے بھی روپیہ لے کر جان چھوڑ دی۔ خدا کرے کہ ملک الموت جان لے کر ایمان چھوڑ دے۔ ہماری طرح صدہا جوان بچے' بوڑھے' مرد' عورتیں کچھ ہم سے دور کچھ نزدیک بہے جا رہے تھے۔ کسی کو کسی سے سروکار نہ تھا۔ نہ معلوم ہم میں کیا سرخاب کا پر لگا تھا اور ہماری زندگی کی ایسی کیا ضرورت تھی خواہ مخواہ بچالئے گئے خدا اس بچنے سے بچائے:

ہر آن مصیبت اک نئی پڑتی ہے
جو پڑتی ہے جان پر کڑی پڑتی ہے
چوٹیں کھاتا ہے شیشہ دل دن رات
جیسے گھنٹے پہ موگری پڑتی ہے

بے غیرت کی بلا دور' ننگ خاندان۔ خاندان کو ڈبو کر عزیوں کو کھو کر' ننگے دھڑنگے۔ بھیانک صورت' ڈراونا چہرہ لئے جل مانس بنے ہوئے پھر کنارے تو لگ گئے۔ بہنے والے بہہ گئے۔ ڈوبنے والے ڈوب گئے' گئے اور ایسے گئے کہ لاشوں تک کا پتہ نہ چلا:

سیلاب میں جسم زار گویا خس تھا
غرقاب محیط غم کس و ناکس تھا
اتنے دریا میں بھی نہ ڈوبا امجدؔ
غیرت والے کو ایک چلّو بس تھا

باپ کا وہ قصہ ہوا' ماں کا یہ حال۔ ایسے برخوردار کی بلند اقبالی میں کس کو کلام ہوسکتا ہے:

کس وقت دل غم زدہ مغموم نہیں
رونے دھونے کی کس گھڑی دھوم نہیں
قبر مادر تو خیر بن ہی نہ سکی
لیکن گور پدر بھی معلوم نہیں

☆☆☆

www.urduacademyts.com

ڈاکٹر محمد اکمل خان

اُردو رباعی کا جدِ امجد

اُردو شاعری کی بعض ہیئتیں اور صنفیں شعراء کے لیے بہت مقبول و مانوس رہی ہیں جن میں غزل کی صنف کو اولیت حاصل ہے تاہم دیگر اصناف کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ رباعی کی بھی تاریخی اہمیت ہے۔ اردو کی بعض دوسری اصناف کی طرح اردو رباعی بھی فارسی رباعی کی مرہون منت ہے۔ اردو رباعی نے اپنا چراغ فارسی رباعی سے روشن ضرور کیا مگر آگے چل کر مقبولیت کے باب میں فارسی رباعی کو پس پشت ڈال دیا البتہ فارسی کی قدیم روایات کا احترام کرتے ہوئے ہیئتی سطح پر کوئی تبدیلی نہیں کی بلکہ اس کے جمالیات میں مزید اضافہ کیا۔ اردو رباعیات ہندوستان کے بدلتے منظر نامے اور تغیرات و انقلابات کی آئینہ دار ہیں اور ہر دور کی سیاسی، سماجی، اخلاقی اور ثقافتی صورت حال کو رباعی میں بخوبی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ اردو رباعی کے قالب میں چونکہ فارسی رباعی کی روح پھونکی گئی ہے اس لیے اس میں فارسی رباعیات کی بیشتر خصوصیات در آئی ہیں۔ موضوع اور ہیئت دونوں اعتبار سے فارسی رباعی اردو رباعی پر اثر انداز رہی ہے۔ اردو رباعی کو سنوارنے، نکھارنے اور نیا رنگ و آہنگ عطا کرنے میں اردو کے ہر دور کے بیشتر سرکردہ شعراء نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ میرتقی میر، سودا، غالب، مومن، انیس، دبیر، نظیر اکبرآبادی، اکبر الہ آبادی، حالی اور فراق گورکھپوری وغیرہ کے نام خصوصاً قابل ذکر ہیں۔ یہ ایسے شعراء کا گروہ ہے جنہیں نقادوں نے دیگر اصناف کی قیود میں اس طرح مقید کر دیا کہ ان کی رباعی گوئی کو قابل قدر مقام نہ مل سکا اگرچہ بحیثیت کمیت ان کی رباعیات کم ہیں تاہم کیفیت اور رباعی کی شعریات کی بنا پر کم درجہ میں گردانا جاسکتا ہے۔ اردو رباعی کے حوالے سے ایک اہم نام امجد حیدرآبادی کا ہے، جنہیں اردو رباعی کی روایت میں انتہائی احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اردو رباعی کی تاریخ اس وقت تک نامکمل رہے گی جب تک اس میں امجد حیدرآبادی کے نام کی شمولیت نہ ہوجائے ان کی رباعیات موضوعاتی اور ہیئتی دونوں سطح پر انفرادیت کی حامل ہیں۔

امجد حیدرآبادی کا اصل نام سید احمد حسین اور تخلص امجد ہے۔ وہ حیدرآباد کے ایک صوفی خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام صوفی سید رحیم علی اور والدہ کا نام صوفیہ تھا۔ تاریخ پیدائش میں اختلاف پایا جاتا ہے جیسا کہ سید نصیرالدین ہاشمی نے ایک اندازے کے مطابق ۱۳۰۳ ہجری لکھی ہے چنانچہ وہ رقم طراز ہیں:

''پیدائش کا صحیح سنہ معلوم نہیں۔ ۱۳۰۰ھ کے چار پانچ سال بعد آپ کی پیدائش ۷؍رجب بروز دوشنبہ ہوئی۔ اس لحاظ سے آپ کی پیدائش ۱۳۰۳ھ قرار دے سکتے ہیں۔ (حضرت امجد کی شاعری، نصیرالدین ہاشمی، ص:۹-۱۰،

www.urduacademyts.com

شمس المطابع نظام شاہی روڈ حیدرآباد ۱۹۳۴ء)

نصیرالدین ہاشمی کے اس نتیجے میں جس لحاظ کو ملحوظ رکھا گیا ہے اسی میں حتمیت کا فقدان ہے کیونکہ ایک طرف انہوں نے ۱۳۰۰ھ کے چار پانچ سال بعد کی طرف اشارہ کیا ہے وہیں دوسرے جملہ میں ہی اپنے قیاس کے خلاف ۱۳۰۳ پر مہر لگادی ہے۔ مذکورہ تاریخ کے مطابق جب ہجری سن کو عیسوی سن میں تبدیل کرتے ہیں تو ۷/رجب ۱۳۰۳ھ مطابق ۱۲/اپریل ۱۸۸۶ بروز دوشنبہ ثابت ہوتا ہے، جبکہ وکی پیڈیا کے مطابق ان کی تاریخ پیدائش یکم جنوری ۱۸۸۸ء ہے۔ بہرکیف یہ امر تاہنوز تحقیق طلب ہے۔ ابھی وہ چالیس دن کے ہی تھے کہ والدمحترم کا انتقال ہوگیا اور ایام طفلی میں ہی شفقت پدری سے محروم ہوگئے اور ان کی پرورش کی پوری ذمہ داری والدہ کے ناتواں کندھوں پر آگئی۔ والدہ اگرچہ بیوہ ہوچکی تھیں اس لیے انہوں نے بیٹے کی تعلیم وتربیت میں بیوگی کو کبھی حائل نہیں ہونے دیا۔ انہیں کے زیرسایہ امجد عہدشباب کو پہنچے۔ ابھی ان کی عمر ۲۰ سال تجاوز ہی کرپائی ہوگی کہ ۱۳۲۶ھ مطابق ۱۹۰۸ء میں دریائے موسیٰ کے سیلابی حادثہ میں نذرسیلاب ہوگئیں۔ مگر وہ اس دارفانی سے کوچ کرنے سے قبل ہی اپنے بیٹے کی زندگی کو کامیاب بنانے کا اہتمام کرگئی تھیں۔

امجد کو بچپن میں پڑھائی لکھائی سے خاصی دلچسپی تھی اور تین برس کی عمر سے ہی کاغذ، تختی اور دیواروں پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچ کر مشق کرنے لگے تھے، مگر جب باقاعدہ تعلیم کا آغاز ہوا تو شروع شروع میں بیزاری کا مظاہرہ کیا مگر خدادادقوت حافظہ کی بدولت جو پڑھتے وہ حافظے میں محفوظ ہوجاتا تھا۔ مکتب کی تعلیم کے بعد مدرسۂ نظامیہ میں داخل ہوگئے مگر وہاں بھی زیادہ دن قیام نہ رہ سکا گھر پر تعلیم جاری رہی۔ علامہ سید علی سوشتری مرحوم سے فارسی اور عربی کی تعلیم حاصل کی۔ پنجاب یونیورسٹی کے زیراہتمام ہونے والے امتحانات منشی، منشی عالم اور منشی فاضل میں بھی اسناد حاصل کیں۔ طالب علمی کا سلسلہ دوران ملازمت بھی جاری رہا۔ فلسفہ کا درس علامہ عبدالحق خیرآبادی کے شاگرد مولانا سید نادرالدین مرحوم سے لیا۔

جیسا کہ مذکور ہوا کہ آپ کے والد کا انتقال ایام طفلی میں ہی ہوگیا تھا والدہ نے تربیت کی اس لیے یہ بات عین فطری ہے کہ معاشی ضروریات کو پورا کرنے کی فکر بچپن سے ہی دامن گیر ہوگئی ہوگی چنانچہ انہوں نے ملازمت کی ابتدا اوائل عمر میں ہی بنگلور میں ایک پارسی ڈاکٹر کو فارسی کی تعلیم دینے کی شکل میں کی اور کچھ دنوں بعد ہی انہیں بنگلور میں ہی ایک مدرسہ میں سرکاری ملازمت مل گئی مگر کچھ عرصہ بعد ہی ملازمت ترک کرکے اپنے وطن حیدرآباد واپس آگئے اور ایک مدرسہ میں تدریس سے وابستہ ہوگئے اور چند سال بعد ہی دفتر صدر محاسبی میں منتقل ہوگئے اور طویل مدت تک اس سے وابستہ رہے اور مختلف نظریات کے مطابق ۷۳ یا ۷۵ سال کی عمر میں ۱۲۸۰ھ مطابق

www.urduacademyts.com

۱۹۶۱ء میں حیدرآباد میں انتقال ہوا اور نماز جنازہ حضرت عبداللہ شاہ نقشبندیؒ نے پڑھائی۔

آپ پندرہ سال کی عمر سے ہی شاعری کرنے لگے تھے۔ اولاً شیخ ناسخ کے دیوان کے مطالعہ سے شاعری کا شوق پروان چڑھا اور فارسی میں شیخ سعدی کی گلستاں کے مطالعہ نے اس شوق کو مزید مہمیز کیا۔ درج ذیل اردو کا پہلا شعر ہے:

نہیں غم گرچہ دشمن ہوگیا ہے آسماں اپنا
مگر یارب، نہ ہو، نامہرباں وہ مہرباں اپنا

اس طرح فارسی کا پہلا شعر بھی ملاحظہ ہو:

بسانِ سایۂ نصف النہارم پیش پا افتد
اگر خورشیدِ محشر را نظر برداغِ ما افتد

ابتداء میں اردو شاعری کی اصلاح حبیب کنتوری اور فارسی میں علامہ غلامی ترکی سے لی مگر چند عرصے بعد ہی اصلاح لینے کا سلسلہ بند کردیا۔ امجد کا ابتدائی کلام نذر سیلاب ہوجانے کے باعث معدوم ہوگیا۔ ان کا جو بھی کلام آج ہم کو میسر ہے وہ ۱۳۲۲ھ (۱۹۰۸ء) کے بعد کا شائع شدہ ہے۔ جیسا کہ خود انہوں نے رباعیات امجد کے حصہ اول میں لکھا ہے کہ:

''میرے بچپن کے زمانہ کی اردو فارسی رباعیاں آج سے تقریباً بیس برس پہلے طبع ہوچکی تھیں لیکن کامل اشاعت کے قبل اکثر جلدیں طغیانی رودِ موسیٰ ۱۳۲۶ھ میں میرے تمام خاندان کے ساتھ دریا برد ہوگئیں۔''

بیسویں صدی کے شعرائے اردو میں امجد حیدرآبادی کو ممتاز حیثیت حاصل ہے۔ ان کی شاعری اور بالخصوص رباعیات پندوموعظت اوراخلاق حسنہ کا جیتا جاگتا بیانیہ ہیں۔ ان کی انہیں فلسفیانہ اور حکیمانہ خصوصیات و امتیازات کے باعث سید سلیمان ندوی نے انہیں ''حکیم الشعراء'' کے لقب سے ملقب کیا چنانچہ وہ دارالمصنفین سے شائع ہونے والے شمارے معارف میں لکھتے ہیں:

''معارف کا شیوہ نہیں کہ شاعروں کو خطابات بانٹے لیکن حضرت امجد کی نو بہ نو حکمت آموز شاعری نے اس کو اعتراف فضل پر مجبور کیا اور لفظ حکیم الشعراء سے واقعہ کا اظہار کیا ہے۔'' (رسالہ، معارف، اعظم گڑھ، فروری ۱۹۳۳ء)

امجد حیدرآبادی کو نظم و نثر دونوں پر یکساں قدرت حاصل تھی، جس کا بین ثبوت ان کی تصانیف ہیں۔ ان کی تمام تر تصانیف میں رنگ تصوف کو نمایاں طور پر دیکھا جاسکتا ہے جو کہ ان کی بیدار طبیعت کا غالب رجحان ہے۔ ان کی محصول تصانیف یہ ہیں ''ریاضِ امجد'' حصہ اول ودوم، ان میں نظمیں، تضمینیں اور کچھ قطعات ہیں۔ ''خرقۂ امجد'' اس میں نعت اور تصوف پر نظمیں ہیں۔ ''رباعیات امجد'' حصہ اول و دوم اور ''نذر امجد'' ان دونوں تصانیف میں نعتیہ کلام ہے۔ ''جمال امجد'' خودنوشتہ حالات زندگی ہیں اس تصنیف کو شاہکار کا درجہ حاصل ہے۔ یہ تصوفانہ نثر

www.urduacademyts.com

اور حال وقال پر مبنی عمدہ تصنیف ہے۔ ''حج امجد'' ان کا سفرنامۂ حج ہے مگر یہ اردو کے عام سفرناموں کی روشِ عام سے قدرے مختلف ہے۔ ان کے علاوہ ان کی ایک اور نثری تصنیف ہے ''میاں بی بی کی کہانی'' مذکورہ تصانیف کی روشنی میں ہی ان کی ادبی شخصیت کے خطوط متعین کرنے کی حسب استطاعت کوشش کی جائے گی۔

امجد حیدرآبادی کی شاعری سے متعلق گفتگو سے ان کے نظریات شاعری سے واقفیت حاصل کرنا ناگریز ہوگا تاکہ تعین قدر میں مدد مل سکے اور ان کی شاعری کی تعبیر وتشریح انہیں کی قائم کردہ آرا کی روشنی میں کی جاسکے۔ چنانچہ وہ خود لکھتے ہیں:

''شعر ہو یا راگ جب تک سامع کو بے خود نہ کردے، باردفطرت میں حرارت نہ بیدار کردے، قدیم کافر کو مسلمان نہ بنادے کثیر مادے میں لطیف روح نہ پھونک دے، فنونِ لطیفہ میں شمار نہیں کیے جاسکتے۔ ہر شعر ایک مکمل راگ یا تصویر ہوتا ہے..... شاعر کو بھی ہر لفظ اپنے اپنے مقام پر بغیر کسی تعقید کے رکھنا پڑتا ہے۔ اس ترتیب کے قطعِ نظر تناسب اور توازن بھی ضروری اور لازمی چیز ہے..... موزوں نظم بھی اپنی بدنظمی اور غیر مناسب، اور ثقیل الفاظ اور دوراز فہم استعارات اور تلمیحات کی وجہ سے شعر گفتن چہ ضرور بود کا مصداق ہوجاتی ہے..... قافیہ ردیف کے بل پر شعر کہنا، نقالی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا .....اشعار سے پیٹ بھرنے کی بہ نسبت پیپ سے پیٹ بھرنا اچھا ہے صاف ظاہر ہے کہ اس جگہ اشعار سے مخرب اخلاق، لغو اور لاحاصل اشعار مراد ہیں۔ نظم ہو یا نثر، تقریر ہو تحریر اس کا کچھ نہ کچھ حاصل ہونا چاہیے، دینی یا دنیوی، خود اپنے لیے یا غیر کے لیے۔ جس نظم ونثر میں اس امر کا لحاظ نہ ہو اور محض قافیہ پیمائی اور خامہ فرسائی کی جائے بازیچۂ اطفال ہے۔''

(فرقہ امجد، سید احمد حسین امجد، ص:۲،۳،۴، عماد پریس حیدرآباد، دکن ۱۳۴۲ھ)

اقتباس قدرے طویل ہوگیا مگر اس کی اہمیت و افادیت کے پیش نظر مضمون میں شمولیت ناگزیر ہے۔ عموماً شعرائے اردو (چند استثنائی شخصیات کے ماسوا) اس قدر واضح تصورات ادب سے عاری ہیں جس کے سبب ان کی ادبی نگارشات میں فکروعمل کے تضاد کو صراحتاً ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ امجد حیدرآبادی نے مذکورہ اقتباس میں جس راست بیانیہ کا اظہار کیا ہے وہ ان کی دقت نظر کا غماز ہے وہ شاعری میں محض ردیف وقافیہ کی پابندی کے قائل نہیں ہیں اور نہ ہی فقط مضمون نگاری یا واقعہ سازی کو قابل قبول سمجھتے ہیں بلکہ وہ بیک وقت ادب کی تمام تر فکری جمالیات اور فنی محاسن کو ملحوظ رکھنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ جہاں وہ شاعری میں زیاں کاری کے بجائے اس کی افادیت اور اثرآفرینی پر زور دیتے ہیں تو وہیں دوسری جانب شعریات ادب، لفظی تناسب وتوازن اور ظاہری ہیئت وساخت کو بھی اہمیت دیتے ہیں۔ جب ہم ان کے

www.urduacademyts.com

قائم کردہ مذکورہ اصول وقواعد کے تناظر میں ان کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو پوری شاعری ان کے نظریات کی پاسداری اور ترجمانی کرتی نظر آتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کا کلام ان کی فکری اساس کا امین ہے۔

ہر چند کہ امجد نے بعض دیگر اصناف میں بھی طبع آزمائی کی جن میں نعت، قطعہ، تضمین اور نظم نگاری خصوصاً قابل ذکر ہیں مگر ادبی دنیا میں ان کی شہرت دوام اور مقبولیت خاص کا باعث ان کی رباعیات ہیں۔ یہاں اس بات کا اعتراف کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں ہونی چاہیے کہ امجد کے یہاں موضوعاتی سطح پر وہ وسعت نظر نہیں آتی جو دوسرے رباعی گو شعراء کے یہاں ہے خواہ ان کی رباعیات ہوں، نظمیں ہوں یا قطعات ہوں ہر جگہ موضوع میں یکسانیت کا احساس ہوتا ہے تاہم یہ ان کا کمال فن یا فنی چابک دستی سمجھی جاسکتی ہے کہ محدودیت کے باوجود پانے مخصوص موضوعات کو مختلف پیرایے جدا انداز اور منفرد اسلوب کے ذریعہ ہر بار نئی جہت کے ساتھ ادا کر کے وسعت عطا کر دیتے ہیں اور یہی ان کے امتیازات کا سبب ہے۔ رباعیات امجد کے ہر دو حصوں میں شامل ہر رباعی قرآن وحدیث کے کسی نہ کسی نکتہ کی ترجمانی کرتی ہے۔ ان رباعیوں کا اختصاص یہ ہے کہ سرورق کوئی قرآنی آیت یا حدیث کا ٹکڑا رقم کیا ہے اور اس تشریح وتعبیر کے لیے رباعی لکھی ہے جو مفہوم کی عین عکاسی کرتی نظر آتی ہے۔ نمونہ کے طور پر چند رباعیاں ملاحظہ ہوں:

لاالہ الا اللہ، محمد رسول اللہ

معبود کی شان عبد میں پاتا ہوں
تنزیہ سے تشبیہ کی سمت آتا ہوں
کلمہ میں خدا کے بعد ہی نام نبی
کعبہ سے مدینے کی طرف جاتا ہوں

ooo

انسان کی زندگی کی دو سانسیں ہیں
ہر جان کو زندگی کی دو سانسیں ہیں
یہ کلمہ طیبہ کے دو جز نہیں
ایمان کی زندگی کی دو سانسیں ہیں

وتعز من تشاء

ہر ذرہ پہ فضل کبریا ہوتا ہے
اک چشم زدن میں کیا سے کیا ہوتا ہے
اصنام دبی زباں سے یہ کہتے ہیں
وہ چاہے تو پتھر بھی خدا ہوتا ہے

ولاتحملنا مالاطاقة لنا

ہر گام پہ چکرا کے گرا جاتا ہوں
نقش کفِ پا بن کے مٹا جاتا ہوں
تو بھی سنبھال میرے دینے والے
میں بارِ امانت میں دبا جاتا ہوں

لاتقنطوا من رحمة اللہ

بیکس ہوں نہ مال ہے نہ سرمایا ہے
مجھ سے کیا پوچھتا ہے کیا لایا ہے

www.urduacademyts.com

یارب تری رحمت کے بھروسے امجد
بندآنکھ کیے، یوں ہی چلا آیا ہے

لاتاسو علیٰ مافاتکم

ہرچیز کا کھونا بھی بڑی دولت ہے
بیفکری سے سونا بھی بڑی دولت ہے
افلاس نے سخت موت آساں کردی
دولت کا نہ ہونا بھی بڑی دولت ہے

الست بربکم

مجھ میں ہے چھپی ہوئی کوئی شے تیری
نغموں میں مرے ضرر ہے لَے تیری
صورت سے تو آشنا نہیں ہیں آنکھیں
آواز کہیں سنی ہوئی ہے تیری

(رباعیات امجد، حصہ دوم)

مذکورہ رباعیات میں امجد حیدرآبادی کے تصورات شاعری بین السطور سرایت نظر آتے ہیں۔ پندونصیحت اوراخلاق وفلسفہ کے گویا دفتر کھلے ہوں اورایسا محسوس ہوتا ہے جیسے احکام شرعیہ کی شاعرانہ توضیح اورقرآنی آیات کی واضح تفسیر ہوں ہر رباعی کی جداگانہ تشریح کا موقع نہیں ہے البتہ اتناضرور کہاجاسکتا ہے کہ ان کی رباعیات اردو کے دیگر رباعی گوشعراء کے بالمقابل ندرت بیانی، اثرآفرینی، نازک خیالی اورفلسفہ وحکمت کے باب میں بے نظیر ہیں' باوجود اس کے انہیں خودنمائی یا تعلّی کا شائبہ تک نہیں گزرتا اورنہ ہی نام ونمود یا حصول داد کی غرض سے شاعری کرتے ہیں شاعری اور بالخصوص رباعیات کوانہوں نے اپنے اندرون کی تسکین اوراپنے تجربات ومشاہدات کا میڈیم بنایا ہے جہاں حرص وہوس کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے چنانچہ علیم صبانویدی ان کی رباعی گوئی کے متعلق لکھتے ہیں:

''حضرت امجد کی رباعیات میں گوناگوں موضوعات ملتے ہیں۔انہیں جوبھی قابل بیان موضوع ملتا ہےاسے اپنی مخصوص فکرکا لہوبخشتے ہیں اورموضوع رباعی کا جامہ پہن کر دادتحسین پالیتا ہے۔انہیں کسی سے دادطلب کرنے کی کبھی خواہش پیدانہیں ہوئی۔ وہ رباعی اپنے ذوق کی تسکین کے لیے کہتے ہیں۔'' (جہان اردورباعی، علیم صبانویدی، ص:۷۰، تمل ناڈو اردو پبلی کیشنز، چینائی-۲، ۲۰۱۱ء)

یوں توہرشاعروادیب کی تعیین قدراس کی ادبی نگارشات کی روشنی میں ہوتی ہے تاہم اس سے بھی انکار نہیں کیاجاسکتا ہے کہ اس کے معاصرین واکابرین کے خیالات میں اس کا ادبی مرتبہ کتنا بلند ہے۔ان کی بعض مذکورہ رباعیات کی روشنی میں انہیں سمجھنےاورفکری وفنی اعتبار سے ان کے کلام کو پرکھنے کے لیے رباعیوں کا انداز ناگزیر تھا۔اب چند اقتباسات ملاحظہ ہوں جواس بات کا ثبوت فراہم کریں گے کہ امجد حیدرآبادی نہ صرف اپنے معاصر شعراء بلکہ مابعد اردو رباعی گوشعراء میں اولیت رکھتے ہیں۔چنانچہ سید وحیداشرف لکھتے ہیں:

یادرفتگاں

www.urduacademyts.com

''امجد حیدرآبادی کا نام اردو رباعی گو شعراء میں نہایت ممتاز ہے۔ انہوں نے ایسی رباعیاں بھی لکھی ہیں جو فنی اعتبار سے میر انیس کے آہنگ کو چھوتی ہیں۔''

(مقدمۂ رباعی، سید وحید اشرف، ص:٦٦، مخدوم سید اشرف جہانگیرا کادمی بڑودہ، ۲۰۰۱ء)

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور لکھتے ہیں:

''حضرت امجد کے کلام سے نہ صرف اردو شاعری فارسی کی ہم پلہ بن گئی بلکہ حیدرآباد کی عزت و آبرو میں ایک ایسا اضافہ ہوا جس پر یہاں رہنے بسنے والے ہمیشہ ناز کرتے رہیں گے۔''

شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی امجد کی رباعیات کے متعلق رقم طراز ہیں:

''اختلاف مسلک کے باوجود جب امجد کی رباعیات پڑھتا ہوں اور سنتا ہوں تو جھوم جھوم جاتا ہوں۔ یہ امجد کی شاعرانہ عظمت کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ وہ شاعر جو کسی منکر اور مخالف کو بھی داد دینے پر مجبور کردے کوئی معمولی شاعر نہیں ہوسکتا۔''

سید مناظر الحسن گیلانی ان کی ادبی شخصیت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حضرت امجد ہندوستان کے ان شعراء میں ہیں جن کو زمانہ صدیوں کے بعد پیدا کرتا ہے۔ ان کے سامنے سچی باتیں ہمیشہ صف بستہ رہتی ہیں۔''

علامہ عبداللہ عمادی ان کی رباعیات کی افادیت کو تسلیم کرتے ہوئے اس انداز میں رقم طراز ہیں:

''ان رباعیوں میں قرآن کریم کی کسی نہ کسی آیت یا حدیث شریف کے کسی نہ کسی مفہوم کی جانب ایک دل آویز دلنشین انداز میں ایماء ہے ملت کو ایسی ہی تعلیم کی ضرورت ہے۔''

(جنوبی ہند میں رباعی گوئی، سید مظفرالدین خاں، ۳۸، ۳۹، نیشنل پریس چارکمان، حیدرآباد، ۱۹۸۴ء)

درج بالا اقتباسات پر ہی اکتفا کیا جارہا ہے ورنہ امجد حیدرآبادی کے متعلق اکابرین کی آرا کو ہی اگر یکجا کیا جائے تو ایک مفصل مضمون تیار ہوسکتا ہے مگر اس مقام پر مضمون کی اقتضا کے مطابق ان اقتباسات کی شمولیت واجبی ہے جسے نظرانداز کیا جانا خلاف قیاس ہوگا۔

الغرض رباعیات امجد اور اکابرین کی آرا کے پیش نظر یہ کہنے میں چنداں تامل نہیں ہے کہ رباعیات امجد شفق اردو رباعیات پر مہرتاباں کی مصداق ہیں۔ اردو رباعی کی مختصر ترین تاریخ بھی تب تک مکمل نہیں ہوسکتی جب تک اس میں رباعیات امجد کی شمولیت نہ ہوجائے اور اردو رباعی گو شعراء کی فہرست حضرت امجد کے نام کے بغیر ادھوری رہے گی۔ جب تک اردو رباعیات کا نام باقی رہے گا حضرت امجد کے نام کی چمک بھی تب تک پھیکی نہیں پڑسکتی۔

امجد حیدرآبادی نے اگرچہ خود کے لیے رباعی کو مخصوص کرلیا اور اسے بام عروج تک پہنچانے میں نمایاں کردار ادا کیا مگر انہوں نے دیگر اصناف میں بھی کامیاب

www.urduacademyts.com

طبع آزمائی کی ہے، جن میں نظم نگاری، غزل، قطعہ اور تضمین خصوصاً قابل ذکر ہیں اگرچہ ان اصناف میں ادبی سرمایہ بحیثیت کمیت کم ہے مگر فکری وفنی اعتبار سے انہیں کمتر تصور کرنا زیادتی کے مترادف ہوگا۔

جیسا کہ مذکور ہوا کہ امجد ایک صوفی خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور خود بھی بلند مرتبہ صوفی تھے۔ ان کے یہاں قال سے زیادہ حال پر زور دیا گیا ہے جسے ان کے ہر نوع کے کلام میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ ان کے یہاں آورد کے بجائے آمد کی گھن گرج سنائی دیتی ہے۔ حالت کیف میں جو بھی ان پر گزرتا وہی زبان وقلم سے ادا ہو جاتا جس کی ترجمانی ان کی نظموں میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ ان کی نظموں کے مجموعوں میں مختلف عنوانات کے تحت نظمیں شامل ہیں۔ ''ریاض امجد'' حصہ اول میں ''صدائے درویش''، ''دربار خواجہ''، ''جوش رحمت''، ''فریاد مجنوں''، ''دنیا اورانسان''، ''عاشق کا جنازہ''، ''مجلس سماع''، ''بیٹ کا ظلم'' اور ''کوئلہ بھئی نہ راکھ'' خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔ اسی طرح ''ریاض امجد'' حصہ دوم کے موضوعات بھی اسی نوعیت کے ہیں جن میں ''ولا رطب ولا یابس''، ''سبحان ربی الاعلیٰ''، ''حکایت وشکایت''، ''قل متاع الدنیا قلیل''، ''میر رام کہاں ہے'' اور ''مکالمہ جان وتن'' خصوصیت کی حامل ہیں۔ ان نظموں کے عنوانات سے ہی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی نظمیہ شاعری کے موضوعات بھی رباعیات کے مانند متصوفانہ ہیں۔ اسی طرح ''خرقۂ امجد'' کی تمام نظمیں بھی صوفیانہ ہیں۔

اسی طرح امجد غزلیات کی جمالیات سے بھی بخوبی واقف ہیں مگر چونکہ تصوف کے اثرات ان کی شخصیت پر زیادہ گہرے تھے اس لیے ان کی غزلوں میں عشق مجازی کے بجائے عشق حقیقی کے عناصر پائے جاتے ہیں اور دیگر شعراء کی عام روش کے برخلاف بھرتی کے اشعار ان کے یہاں آٹے میں نمک کے مانند بھی دکھائی نہیں دیتے اس لیے ان کی غزلیں ہر طرح کے حشو وزوائد سے یکسر پاک ہیں۔ ان کی غزلوں میں بھی تصوف اور فلسفیانہ مباحث کے دفاتر نظر آتے ہیں۔ انہوں نے غالب کی بعض زمینوں میں بھی غزلیں کہی ہیں۔ نمونۂ کلام کے طور پر چند مطالع ملاحظہ ہوں:

دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں رلائے کیوں
(غالبؔ)

نالۂ جان خستہ جاں عرشِ بریں پہ جائے کیوں
میرے لیے زمین پر صاحب عرش آئے کیوں
(امجدؔ)

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی درد بے دوا پایا
(غالبؔ)

باغباں کی منت سے آپ کو رہا پایا
جس نے غنچۂ دل کو باغ دلکشا پایا
(امجدؔ)

www.urduacademyts.com

شبنم بہ گل لالہ نہ خالی ز ادا ہے
داغ دل بے درد نظر گاہ حیا ہے
(غالبؔ)

ہے اور یقینی ہے یہی سب کی صدا سے
لیکن نہیں معلوم کہ وہ کون ہے؟ کیا ہے؟
(امجدؔ)

ان کی تمام تر غزلیں عشق حقیقی اور فلسفہ وحکمت کی آئینہ دار ہیں مگر افسوس کہ انہوں نے اردو کی غزلیہ شاعری میں زیادہ سرمایہ نہیں چھوڑا اور اس صنف کی جانب خاطرخواہ توجہ مبذول نہیں کی۔ نصیرالدین ہاشمی ان کی غزل گوئی سے متعلق رقم طراز ہیں:

''آپ کی غزل بھی تصوف اور فلسفہ کا معدن، حقیقت اور اصلیت کا خزانہ ہوتی ہے۔ ہر شعر میں بجلی کی سی چمک اور تڑپ پائی جاتی ہے۔ وہ سوز گداز کی بولتی تصویر ہوتی ہے۔'' (حضرت امجد کی شاعری، نصیرالدین ہاشمی، ص:۴۷، شمس المطابع نظام شاہی روڈ حیدرآباد، ۱۹۳۴ء)

ضمناً اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا جاچکا ہے کہ انہوں نے بعض شعراء کے کلام پر تضمین بھی لگائی ہے اور کچھ قطعات بھی لکھے ہیں مگر ان کے ہر قسم کے کلام میں تصوف، اخلاق، حکمت اور فلسفہ کا رنگ غالب رہتا ہے۔ انہوں نے فانی دنیا کی بہ نسبت اخروی زندگی کو زیادہ ترجیح دی ہے اور یہی اصل تصوف اور روح تصوف ہے اور ان کا سارا کلام اسی فکری اساس کا علمبردار ہے۔ آخر میں فرمان فتحپوری کا قول نقل کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا وہ امجد کی ادبی شخصیت کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''امجد ایک صوفی، قانع، متوکل اور خداترس آدمی ہیں اور ان کے موضوعات حقائق و معارف، عبادت الٰہی، اخلاق و فلسفہ اور تصوف و عرفان حقیقی تک محدود ہیں پھر بھی ان میں خشکی و بے کیفی بہت کم ہے۔'' (اردو میں رباعی ڈاکٹر فرمان فتحپوری، ص:۱۱۳، مکتبۂ عالیہ لاہور، ۱۹۸۲ء)

ooo

ڈاکٹر محمد اکمل خان
گیسٹ فیکلٹی (اُردو)، نظامت فاصلاتی تعلیم
مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی،
گچی باؤلی، حیدرآباد 032 500 (تلنگانہ)
Mobile No. 9491971786

مضمون نگاران سے ایک درخواست

مضامین صاف، خوش خط اور صفحہ کے ایک جانب لکھ کر روانہ کریں۔ اگر Inpage میں ٹائپ کروا رہے ہوں تو اس کی Soft Copy قومی زبان کے ای میل پر روانہ فرمائیں۔ اپنے مضامین کے ساتھ اپنا صحیح نام جو بنک اکاؤنٹ میں درج ہے ضرور لکھیں اور بنک پاس بک کی کاپی، اپنا مکمل پتہ معہ پن کوڈ نمبر روانہ کریں۔

ادارہ قومی زبان

www.urduacademyts.com

منشی نول شکور۔ علمی، ادبی اور سماجی خدمات

انیسویں صدی کے آخر پچاس سال ہندوستان کی تاریخ میں زرین حروف میں لکھے جانے کے قابل ہیں۔ زندگی کے مختلف شعبوں میں طرح طرح کی صحت مند تبدیلیاں رونما ہوئیں ۔ نشاۃ الثانیہ کے اس عہد میں بڑے بڑے کارنامے انجام پائے۔ ایک نئے سماج کی ضروت نے حساس طبیعتوں کو اپنی بہترین صلاحیتوں کو بروئے کار لانے پر مجبور کر دیا۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد ہندوستان کے بسنے والے ہندو اور مسلمان اس قصور سے کانپ رہے تھے کہ انگریزوں کی فولادی طاقت ان کے شاندار ماضی اور تہزیب وتمدن اور علم وادب کے خزانوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مٹا دے گی۔ مگر ان کی کوششیں ناکام ثابت ہوئیں کیونکہ مادر ہند کے ہونہار فرزند منشی نولکشور اس پر کسی طرح تیار نہ تھے کہ وہ ہندو مسلمانوں کی مذہبی روایات، علمی ادبی شہ پاروں اور علوم وفنون کو بدیسی حکمرانوں کے رحم وکرم چھوڑ دیں، چنانچہ اُنھیں ہر طرح کی دخل اندازیوں کے باوجود یہ کام بہت آسان معلوم ہوا۔ آج عربی، فارسی، اردو اور اسلامی دینیات کا جتنا بڑا اور وقیع خزانہ نولکشور پریس کی شائع شدہ کتابوں میں ملے گا وہ برصغیر ہندو پاک کے کسی دوسرے مطبع میں نظر نہیں آ سکتا۔ منشی جی نے بظاہر کتابیں شائع کیں مگر انھیں کتابوں میں انھوں نے دنیائے علم و ادب کو وہ تحفے عطا کئے جو ہر شخص کے بس میں نہیں۔

۳؍جنوری ۱۸۳۶ء کو بروز اتوار متھرا ضلع کے ریڑھا نامی گاؤں میں منشی نولکشور کا جنم ہوا۔ پنڈت جمنا پرشاد بھارگوا کے یہ منجھلے بیٹے تھے۔ ان کے والد علی گڑھ کے ایک زمیندار تھے۔ ان کے دادا پنڈت بال مکند ''مغل شہنشاہ شاہ عالم کے عہد میں خزانہ کے افسر اعلی تھے۔ منشی جی کی ابتدائی تعلیم آگرہ کالج آگرہ میں ہوئی۔ اٹھارہ سال کی عمر میں لاہور کے مشہور اخبار ''کوہ نور'' کے ایڈیٹر منشی ہرسکھ رائے سے ان کی ملاقات ہوئی۔ انھوں نے صحافت اور طباعت میں منشی جی کی دل کھول کر رہنمائی کی۔ لاہور سے واپسی پر ۲۲ سال کی عمر میں منشی جی نے لکھنؤ میں اپنا مطبع نولکشور قائم کیا جو آج ایشاء کا سب سے زیادہ قدیم مطبع ہے۔ ۲۶؍نومبر ۱۸۵۸ء کو انھوں نے اسی پریس سے مشہور اودھ اخبار اُردو میں نکالا۔ یہ اخبار شمالی ہندوستان کا سب سے پہلا اُردو اخبار تھا اور اس کی علمی ادبی حیثیت آج بھی مسلّم ہے۔

تھوڑے ہی عرصہ میں اس اخبار کی تعداد اشاعت ۱۲ ہزار تک پہونچ گئی۔ اُس زمانہ میں کاغذ کی قلت اور نقل وحمل کی دشواریوں کے باوجود اس اخبار کی مقبولیت کا اندازہ اس کی تعداد اشاعت سے کیا جا سکتا

یادرفتگاں

www.urduacademyts.com

ہے۔ ہندوستان کے باہر دوسرے ممالک مثلاً برما' انگلینڈ اور مغربی ایشیا میں اس کے پڑھنے والے موجود تھے۔اس زمانہ کے مشہور اہل قلم اور صاحبان علم وفن نے اودھ اخبار میں اپنے مضامین شائع کرنا شروع کئے۔مشہور پروفیسر ای۔ایچ۔پامرس اس اخبار کے نامہ نگار تھے۔منشی جی کو اُردو' فارسی' عربی' ہندی' سنسکرت گرمکھی اور بنگالی زبانوں کے غیر مطبوعہ شاہکاروں کی تلاش رہتی تھی' چنانچہ انھوں نے اس مطبع سے اپنی زندگی میں چار ہزار کتابیں شائع کیں۔ انھیں مذہب اور دینیات سے گہرا تعلق تھا۔ چنانچہ انھوں نے مسلمانوں اور ہندوؤں کی مذہبی کتابوں کو شائع کرنے میں جس انہماک اور خلوص سے کام لیا وہ کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔قرآن شریف کی طباعت ان کا خاص مشغلہ تھا۔ اسی طرح انھوں نے سکھوں کی مذہبی کتاب گرنتھ صاحب اور 'جنم ساکھی' کو بھی بڑے اہتمام سے شائع کیا۔اس طرح مختلف مذاہب میں یک جہتی اور یگانگت کا اہم فریضہ بھی انھوں نے ادا کیا۔

مسلمانوں کی کتابوں کا ہندی زبان اور ہندوؤں کی کتابوں کا اردو فارسی میں ترجمہ کروا کر منشی جی نے جو خدمت انجام دی وہ ناقابل فراموش ہے۔ترجمہ کے لیے انھوں نے ماہرین فن کی خدمات حاصل کیں۔ ۱۸۵۸ء کے بعد کے مشہور اردو شعرا' اور دیگر اہل قلم کسی نہ کسی حیثیت سے اس مطبع سے وابستہ رہے۔اسی مطبع سے مرزا غالبؔ اور آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کا کلام بڑے اہتمام کے ساتھ شائع ہوا۔مرزا غالبؔ نے ایک خط میں لکھا ہے:۔

''اس چھاپہ خانے نے جس کا بھ دیوان چھاپا اس کو زمین سے آسمان پر پہونچا دیا''۔

منشی جی کی ذہنیت تاجرانہ نہ تھی۔ان کا مطمح نظر یہی رہا کہ اعلیٰ سے اعلیٰ کتابوں کو کم سے کم قیمت پر مہیا کریں تاکہ عوام الناس ان سے مستفید ہوسکیں۔کاغذ کی قلت کو دور کرنے کے خیال سے انھوں نے ایک علیحدہ کارخانہ کھول دیا تاکہ کتابوں کی اشاعت پر اثر نہ پڑے۔کاغذ کا یہ کارخانہ شمالی ہند میں کاغذ بنانے والا سب سے پہلا کارخانہ تھا۔مطبع نول کشور کی شاخیں کانپور' لاہور' پٹیالہ اور لندن میں بھی قائم کیں۔

بحیثیت انسان منشی جی کیا تھے یہ غالبؔ کی زبان میں سنئے:۔

''خالق نے ان کو زہرہ کی صورت اور مشتری کی سیرت عطا کی ہے''۔

وہ نہایت فیاض' خوش اخلاق اور مرنجان مرنج انسان تھے۔انھوں نے مختلف تعلیمی اور سماجی اداروں کی مالی امداد کو اپنا اولین فریضہ سمجھا۔مسلم یونیورسٹی علی گڈھ' کیننگ کالج لکھنؤ' ڈفرن ہسپتال لکھنؤ اور مختلف لائبریریوں کی مالی امداد سے وہ کبھی غافل نہیں رہے۔

www.urduacademyts.com

ملک وقوم کی خدمت انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں کی۔ انگریزی حکومت نے ان کو سی آئی اے کے خطاب سے نوازا۔ مختلف اداروں کے ممبر اور سرپرست مقرر ہوئے۔ شہنشاہ افغانستان امیر عبدالرحمٰن کی آمد کے موقع پر لدھیانہ میں جو دربار منعقد ہوا تھ اس میں منشی جی کو شہزادوں کے برابر جگہ دی گئی جس پر وہ لوگ برہم ہوئے۔ مگر بانی دربار گورنر جنرل پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا اور اس نے شہزادوں کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے کیا:

''مجھے افسوس ہے کہ آپ لوگ جس ہستی کے بارے میں نہیں جانتے اس پر اعتراض کرتے ہیں۔ آپ لوگوں کو کیا معلوم کہ یہ ہمارے معزز منشی نول کشور جی ہیں''۔

یہ سنتے ہی امیر عبدالرحمٰن چونک پڑے اور انھوں نے منشی جی کو اپنے قریب بلا کر اپنے تخت پر بٹھایا اور فرمایا:

ہندوستان آکر مجھے یہ شرف نصیب ہوا کہ آپ سے ملاقات ہوگئی۔ مجھے کسی اور بات سے اتنی خوشی نہیں ہوئی۔ یہ سن کر شہزادوں کا بڑا حال ہوگیا اور انھوں نے اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے منشی جی سے معذرت خواہی کی۔ اس زمانہ میں شہنشاہ ایران بھی ایک بار ہندوستان تشریف لائے تھے اور انھوں نے آکر کہا:

''میرے یہاں آنے کے دو مقصد ہیں ایک تو گورنر جنرل اور دوسرے منشی نولکشور سے ملاقات کرنا اور بس''۔

منشی جی کے دل میں ملک وقوم کی محبت حد درجہ تھی۔ انگریزی حکومت انھیں جس نگاہ سے دیکھتی تھی اس کا یہ تقاضہ نا تھا کہ وہ کانگریس کا نام بھی لیں مگر وہ ایسے نہ تھے۔ انھوں نے سر سریندر ناتھ بنرجی اور اے۔او۔ ہیوم کے ساتھ مل کر کانگریس کے قیام کے لیے بہت جدوجہد کی وہ اس جماعت کو مستقل طور پر مالی امداد بھی دیتے تھے اودھ اخبار میں انھوں نے کانگریس کی پالیسیوں کی علی الاعلان حمایت کی اور انھیں حکومت وقت کا ذرا بھی خوف نہ آیا۔ اس طرح ان کی حب الوطنی اور قوم پرستی اظہر من الشمس تھی۔ منشی جی نے تیس لائبریریاں قائم کیں۔ اس طرح انھوں نے ایک نہایت کامیاب زندگی گزار کر صرف ۵۹ برس کی عمر میں دفعتاً انتقال کیا۔ ۱۹ر فبروری ۱۸۹۵ء کو یہ چراغ گل تو ہوگیا مگر اس کی ضوپاشیاں ابھی تک جاری ہیں۔

☆☆☆

www.urduacademyts.com

حسرتؔ کی غزل: شورشِ عشق کا قلبی تموّج

حسن کو جور سے بیگانہ' نہ سمجھو' کہ اسے
یہ سبق' عشق نے' پہلے ہی پڑھا رکھا ہے

عشق ایک ایسا جذبہ ہے جسے کبھی شکست نہیں دی جاسکتی۔ یہ نا قابل تسخیر اکائی ہے۔ اردو ہی نہیں دنیا کی تمام زبانوں کی شاعری کے بڑے حصے کو اس نے اپنی سحر انگیزی سے متاثر کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی ہر زبان کے ادب پر اس کی حکمرانی ہے۔ بالعموم اردو شاعری اور بالخصوص اردو غزل پر اس کا اثر نمایاں ہے۔ غزل اردو کی پہچان، عشق کا عنوان' حسن کا بیان' محبت کی زبان ہے۔ انسان کے داخلی واردات اور قلبی جذبات کی نمائندگی جس عمدگی سے اس نے کی ہے' کسی اور صنف نے نہیں کی۔ شاید اسی لیے رشید احمد صدیقی نے 'غزل کو اُردو شاعری کی آبرو' کہا ہے۔ غزل کو اُردو شاعری کی آبرو کے عہدے پر فائز کرنے اور اسے عروجِ کمال پر پہنچانے میں عاشقِ تغزل حسرتؔ موہانی کا غیر معمولی کردار رہا ہے۔ اگر غدر کے بعد زوال آمادہ اُردو غزل کی گرتی ہوئی نبض کو حسرتؔ نے سنبھالا نہ دیا ہوتا تو رشید احمد صدیقی کے مذکورہ قول میں سچائی کم اور مبالغہ زیادہ ہوتا۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہاں رشید احمد صدیقی کا وہ قول درج کروں جس میں وہ خود اعتراف کرتے ہیں:

''بایں ہمہ یہ کہنے میں شاید ہی کسی کو تامل ہو کہ حسرتؔ کا غزل پر بڑا احسان ہے اور میرے نزدیک جس کا غزل پر احسان ہے اس کا پوری اردو شاعری اور اردو زبان پر احسان ہے۔ حسرتؔ نے غزل کی آبرو اس زمانے میں رکھ لی جب غزل بہت بدنام اور ہر طرف نرغے میں تھی۔ انھوں نے اردو میں غزل کی اہمیت اور عظمت ایک نامعلوم مدت تک منوالی''۔

حسرتؔ غزل کے سچے پاسبان تھے۔ اردو شاعری میں ایسے معدودے چند شاعر ہوئے ہیں' جنھوں نے صرف غزل ہی کی مشاطگی میں اپنی متاعِ حیات صرف کردی' ان میں حسرت کا نام سرِ فہرست رکھا جاسکتا ہے۔ وہ ایک ایسے شاعر ہیں' جنھیں کسی نے امامِ تغزل' تو کسی نے 'غزل کے نشاۃ الثانیہ کا امام' قرار دیا تو کسی نے 'عاشقِ غزل' کہا۔ حسرتؔ شش جہت فن کار تھے۔ انھیں علی گڑھ یونیورسٹی سے ملک کی آزادی کی خاطر جیل جانے والا پہلا طالب علم ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔ وہ شاعر جس کے اختراعی ذہن نے ملک کو' انقلاب زندہ باد' کا نعرہ دیا' ملک کی 'مکمل آزادی' کا مطالبہ کرنے والا پہلا مجاہد بنا۔ اس نے فرنگیوں کے خلاف 'گوریلہ جنگ' لڑنے کی حمایت کی۔ جو 'سودیشی تحریک' کا پاسباں رہا' تقسیمِ ملک کا مخالف تھا۔ آئین ساز اسمبلی اور پارلیمنٹ کا رُکن، متمول خاندان کا چشم و

یادرفتگاں

www.urduacademyts.com

چراغ ہونے کے باوجود، چھوٹے سے مکان میں رہتا تھا۔ گھر کا سودا سلف خود خرید کر لاتا تھا۔ بلدیہ کے نل سے گھر کے لیے بلا جھجک پانی بھرتا تھا۔ جاگیردارانہ گھرانے سے تعلق کے باوجود گھر میں سلے، بغیر اِستری کے کپڑے پہنتا تھا۔ جس نے ٹرین کے تھرڈ کلاس میں سفر کرنے میں کبھی شرم محسوس نہیں کی، نہ ہی یکہ پر سواری کرنے میں کبھی ہچکچاہٹ۔ ان تمام خوبیوں کا مالک بھلا کیوں کر شش جہت فن کار نہ کہلائے؟ ہاں سیاست ان کا کمزور پہلو رہا ہے۔ ہم جانتے ہیں وہ سیاست سے تو وابستہ رہے مگر نہ سیاست ان کو راس آئی، نہ وہ سیاست کو راس آئے۔ لیکن ادب میں انھوں نے غدر کے بعد کی نیم جاں اردو غزل کو 'آبِ حیات' اور غزل نے انھیں حیاتِ جاوید عطا کی۔ یوں حسرتؔ 'غزل کے ''نشاۃ الثانیہ کے امام'' بن گئے۔ جس کا بین ثبوت ایک نہیں، دو نہیں، (۱۳) دواوین پر مشتمل کلیاتِ حسرتؔ ہے۔

کلیاتِ حسرتؔ کے ابتدائی گیارہ دواوین میں نہ صرف حروفِ تہجی میں شعر ملتے ہیں بلکہ ہر ردیف میں شعر موجود ہے۔ ان میں بقول نیاز فتح پوری کل (۱۷۷) غزلیں ہیں اور ان میں سے (۳۷۳) غزلیں۔ حسرتؔ نے قیدِ فرنگ کے دوران نقشِ قرطاس کی ہیں۔ حسرتؔ نے اپنی ہر تخلیق کے ساتھ اس کی تاریخ بھی درج کی ہے۔ اس کی بنیاد پر یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ حسرتؔ کی شاعری کا تقریباً نصف حصہ ان کے قید و بند کے زمانے کی یادگار ہے۔ جس زمانے میں حسرتؔ بقیدِ فرنگ تھے، وہ اپنا کلام کسی طرح ان کی اہلیہ تک پہنچا دیتے تھے۔ بیگم حسرتؔ موہانی مسودہ موصول ہونے پر اسے ترتیب دے کر بہ شکلِ دیوان شائع کرواتی تھیں۔ حسبِ روایت حسرتؔ نے شاعری کا آغاز غزل سے کیا۔ انھوں نے بیس برس کی عمر میں شاعری کے میدان میں قدم رکھا۔ اپنی شعر گوئی کی ابتدا کے سلسلے میں وہ خود فرماتے ہیں:

''ابتدائے شاعری اس فقیر کی ۱۸۹۵ء سے ہوئی۔ اس سنہ سے اس کی غزلیں پیامِ یار لکھنؤ و ریاضِ سخن وغیرہ گلدستوں اور رسالوں میں شائع ہونے لگیں۔ اس سے قبل کا کلام عشقِ ابتدائی کا نمونہ ہے۔ اعتبار کے قابل نہیں، اب تک وہ کہیں شائع ہوا ہے نہ آئندہ ہوگا۔''

حسرتؔ صرف غزل کے شاعر تھے۔ میدانِ سخن میں انھوں نے اپنی تمام تر توجہ غزل کے بال و پر سنوارنے میں صرف کردی۔ انھیں غزل سے قلبی وابستگی اور ذہنی ہم آہنگی تھی۔ شاید اسی لیے شاعری کا آغاز بھی غزل سے کیا۔ حسرتؔ کی غزل کا مرکز و محور عشق ہے۔ عشق میں وہ منزل و گام پر یقین رکھتے ہیں۔ نشاطیت اور رجائیت کا عنصر ان کی غزل کا مرکزی وصف ہے۔ وہ ہر وقت محبوب سے اتصال کے متمنی اور ملاقات کے ملتجی نظر آتے ہیں۔ ان کی نظریں ہمہ وقت معشوق کے دیدار کی متلاشی رہتی ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی شاعری میں محبوب کی مختلف اداؤں کی بڑی خوبصورت

www.urduacademyts.com

تصویریں پیش کرتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے ان کی آنکھ ایک کیمرہ ہے اور وہ حسن کو جس انداز میں دیکھتے ہیں، اس کی دلکش و رنگین تصویر اپنی شاعری میں اس طرح پیش کر دیتے ہیں کہ وہ محاکات کی مثال بن جاتی ہے۔ عشق میں محبوب کی گلی کے چکر، لگانا اور اس کے دیدار کے لیے مضطرب ہونا، فطری عمل ہے لیکن اس ادا کو سہلِ ممتنع میں سپردِ قلم کرنا فنی کرشمہ ہے۔ پروفیسر انور جمال نے سہلِ ممتنع کی کیا خوب تعریف بیان کی ہے:

''سہلِ ممتنع شعری اظہار کی اصطلاح ہے۔ ایک ایسا شعر جو اس قدر آسان لفظوں میں ادا ہو جائے کہ اس کے آگے مزید سلاست کی گنجائش نہ ہو''

حسرتؔ کے کلام میں سہلِ ممتنع کی سینکڑوں مثالیں موجود ہیں جس کے باوصف ان کی غزل مقبولِ عام و خاص بن گئی۔ جو کلامِ حسرتؔ کا اضافی وصف ہے۔ چند اشعار جن میں دلکش و رنگین تصویریں ہیں، ملاحظہ فرمائیں:۔

گھر سے ہر وقت نکل آتے ہو کھولے ہوئے بال
شام دیکھو نہ مری جان سویرا دیکھو

دوپہر کی دھوپ میں میرے بلانے کے لیے
وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے

بار بار اُٹھنا اسی جانب نگاہِ شوق کا
اور تیرا غرفے سے وہ آنکھیں لڑانا یاد ہے

شوق میں مہندی کے وہ بے دست و پا ہونا ترا
اور مرا وہ چھیڑنا وہ گدگدانا یاد ہے

تجھ سے کچھ ملتے ہی وہ بے باک ہو جانا مرا
اور ترا، دانتوں میں، وہ انگلی دبانا یاد ہے

تم نے بال اپنے جو پھولوں میں بسا رکھے ہیں
شوق کو اور بھی دیوانہ بنا رکھا ہے

دیکھنا بھی تو انھیں دور سے دیکھا کرنا
شیوۂ عشق نہیں حُسن کو رُسوا کرنا

درج بالا اشعار حسرتؔ کے کمالِ فن کے مظہر، سہلِ ممتنع کی بہترین مثال، تاثیر کی قوت سے مالا مال اور تادیر زندہ رہنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

میدانِ عشق کے تین کردار اہم ہیں عاشق، معشوق اور رقیب۔ حسرتؔ کی غزل کا مطالعہ کیجیے تو یہ تینوں کردار قاری کے روبرو پیش ہوتے ہیں۔ قاری تماشائی ہے۔ اکثر اشعار میں حسرتؔ کی شکایتیں اس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر دیتی ہیں۔ کون ہوگا جو حسرتؔ کی شورشِ عشق کے اس قلبی تموج پر داد نہیں دے گا؟

شکوۂ جور، تقاضائے کرم، عرضِ وفا
تم جو مل جاؤ، کہیں ہم کو، تو کیا کیا نہ کریں

جب دیا، تم نے، رقیبوں کو دیا، جامِ شراب
بھول کر بھی، مری جانب کو، اشارا نہ کیا

یوں غیر سے، بے باک اشارے، سرِ محفل
کیا یہ، مری ذلت ہی نہیں، آپ کے نزدیک

www.urduacademyts.com

بزمِ اغیار میں ہر چند وہ بے گانہ رہے
ہاتھ آہستہ مرا پھر بھی دبا کر چھوڑا
ہم سے دل آپ نے اٹھا تو لیا
پر کہیں اور بھی لگا نہ سکے

حسرتؔ کی غزل شورشِ قلب کا فطری اظہاریہ ہے۔حسرتؔ کی عشقیہ شاعری میں جہاں ایک طرف ایک سیدھے سادے عاشق کے دلی جذبات اور قلبی واردات کی لہریں ڈوبتی ابھرتی محسوس ہوتی ہیں تو دوسری جانب ایک چلتے پھرتے معشوق کی شوق و چنچل ادائیں بھی نظر آتی ہیں۔ان کا محبوب زمینی ہے۔وہ گوشت پوست کا حقیقی انسان ہے۔ان کی غزل میں محبوب سے قربت کا احساس اور عشق میں کامیابی کی امید ایک خاص انداز سے پیش ہوئی ہے۔جس کی وجہ سے ان کے رنگِ تغزل میں امید و نشاط کے پہلو ابھر کر آتے ہیں۔

راہ میں ملیے کبھی مجھ سے تو از راہِ ستم
ہونٹ اپنا کاٹ کر فوراً جدا ہو جایئے
ایسے بگڑے وہ سن کے شوق کی بات
آج تک ہم سے بول چال نہیں
سن کے مجھ سے وہ خواہشِ پا بوس
ہنس کے کہنے لگے مجال نہیں
مائلِ شوق مجھے پاکے وہ بولے ہنس کر
دیکھو تم نے جو چھوئے آج ہمارے بال

حسرتؔ کی غزل روایت اور جدت کے امتزاج سے نمو پاتی ہے۔اس میں معشوق کے خدوخال ہیں،اس کے جور و ستم ہیں،عشق کا فلسفہ ہے،حسن کی پارسائی ہے،عاشق کی پاکبازی ہے،محبوب کا بانکپن ہے،معشوق کی زلفِ گرہ گیر کے پیچ وخم ہیں،غمزہ و انداز ہے،عاشق کا قلبی اضطراب ہے۔غرض حسن و عشق کے متنوع رنگ ہیں۔ان سب کے امتزاج سے جو خمیر بنتا ہے وہ حسرتؔ کی غزل کا روپ اختیار کرلیتا ہے۔حسرتؔ کی غزل پڑھ کر قاری مغموم نہیں ہوتا' بلکہ ایک خوشگوار ماحول کا حصہ بن جاتا ہے۔ان کے شورشِ عشق نے یادِ ماضی کو بڑے دلچسپ پیرائے میں پیش کیا ہے جس کے نتیجے میں غزل کے بعض پارکھوں نے انھیں یادِ ماضی کا شاعر بھی کہا ہے۔وہ ماضی کی بازیافت کے متمنی تھے۔گزرا ہوا زمانہ کسے پسند نہیں ہوتا ہے۔خاص کر عنفوانِ شباب کا زمانہ ہر ایک کو تڑپا دیتا ہے۔پھر حسرتؔ جیسا حساس شاعر اس کے سحر سے کیسے آزاد ہوسکتا ہے۔یادِ ماضی کے موضوع پر ان کے یہ اشعار تو زبان زدِ عام و خاص ہیں۔ان اشعار کو پڑھیے تو یوں لگتا ہے جیسے حسرتؔ کا دیرینہ یار ان کے کان میں سرگوشی کے انداز میں یادِ ماضی کو چھیڑ رہا ہے اور حسرتؔ جواباً اس طرح مسکراتے ہیں جیسے ان کی چوری پکڑی گئی ہو یا کسی محرم نے ان کی دکھتی ہوئی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہو اور پھر وہ دل ہی دل میں گویا ہوتے ہیں:

حقیقت کھل گئی حسرتؔ ترے ترکِ محبت کی
تجھے تو' اب وہ' پہلے سے بھی بڑھ کر' یاد آتے ہیں

لیکن بظاہر وہ یہ کہنے پر مجبور ہیں:

www.urduacademyts.com

نہیں آتی تو' یاد اُن کی' مہینوں تک' نہیں آتی
مگر جب' یاد آتے ہیں' تو اکثر یاد' آتے ہیں

اور حسرتؔ کے باطن میں اٹھنے والا یادوں کا بے پناہ ہجوم ان کو ماضی کے گہرے سمندر میں لے جاتا ہے ۔ یوں حسرتؔ اس میں ڈوب کر شعر لکھتے ہیں اور قاری بھی غواص بن کر ان کا ہم سفر ہوجاتا ہے ۔ گویا حسرتؔ کہہ رہے ہیں 'ہم تو ڈوبیں گے صنم' تم کو بھی ساتھ لے ڈوبیں گے' اور اس طرح یادوں کے اس سلسلے میں ہم غوطہ زن ہوجاتے ہیں اور شورشِ عشق کی یہ ڈوبتی ابھرتی لہریں ہمیں بھی تڑپا دیتی ہیں:

شوق میں مہندی کے وہ بے دست و پا ہونا ترا
اور مرا وہ چھیڑنا وہ گدگدانا یاد ہے
ہجر میں' پاس مرے اور تو کیا رکھا ہے
اک ترے درد کو پہلو میں چھپا رکھا ہے
تجھ سے کچھ ملتے ہی وہ بے باک ہوجانا مرا
اور ترا دانتوں میں وہ انگلی دبانا یاد ہے
چوری چوری ہم سے تم آکر ملے تھے جس جگہ
مدتیں گزریں پر اب تک وہ ٹھکانا یاد ہے
یاد پھر تازہ ہوئی حال سے تیرے حسرتؔ
قیس و فرہاد کے' گزرے ہوئے' افسانوں کی

ایک شعر میں حسرتؔ یاد ماضی کا حوالہ دیتے ہوئے معشوق سے اس طرح شکایت کرتے ہیں ۔ جس میں ان کی خودداری کی جھلک صاف طور پر دکھائی دیتی ہے جس کا انھیں ہمیشہ پاس ولحاظ رہا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں یہ شعر:

اگلی سی نہ راتیں ہیں نہ گھاتیں ہیں نہ باتیں
کیا اب میں وہ حسرتؔ ہی نہیں آپ کے نزدیک

حسرتؔ کے پورے کلیات میں کہیں موت کا ذکر نہیں ملتا۔ وہ زندگی کے شاعر تھے۔ نہایت قانع ثابت ہوئے ہیں۔ جو ملا اسی میں خوش رہنا ان کی فطرت میں شامل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری اپنے قاری کو مایوس نہیں کرتی بلکہ ہر حال میں حالات سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ عطا کرتی ہے۔ ان کا دیوان جو رنگا رنگ پھولوں کا گلدستہ ہے اور جس میں جا بہ جا شگفتہ نگاری کی جھلکیاں نظر آتی ہیں دراصل مایوس دلوں کو حوصلہ عطا کرتا ہے اور مغموم قلوب کو مسرت و بصیرت سے روشناس کراتا ہے۔ حسرتؔ کے کئی اشعار میں ہم دیکھتے ہیں کہ وہ خود ستائش کے دلدادہ ہیں۔ جس کا احساس خود حسرتؔ کو بھی تھا' اور انھیں اس پر فخر بھی تھا۔ یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

حسرتؔ تری شگفتہ نگاری پہ مرحبا
یاد آگئیں نسیمؔ کی رنگیں نگاریاں
طرزِ مومنؔ میں مرحبا حسرتؔ
تیری رنگیں نگاریاں نہ گئیں

مقامِ حیرت ہے کہ میرؔ کے مقلد ہونے کے باوجود حسرتؔ کے کلام میں میرؔ والے غم کا پرتو نظر نہیں

www.urduacademyts.com

آتا۔حالاں کہ حسرتؔ کی زندگی کا بڑا حصہ قید و بند میں گذرا۔ حسرتؔ نے اپنی غزل کو غم پرستی اور یاسیت سے دور رکھا۔اس کے علاوہ فلسفۂ حیات بھی ان کے یہاں نہیں ملتا۔البتہ فلسفۂ عشق پر ان کے یہاں اَن گنت اشعار مل جاتے ہیں۔ان کی غزل میں نہ فانیؔ والا غم ہے نہ اقبال جیسا فلسفہ۔وہ میرؔ، غالبؔ، مومنؔ، مصحفیؔ اور نسیمؔ جیسے شاعروں کے معتقد ہیں جن کے یہاں عشق کے نرالے انداز ہیں جن کی طرز پر غزل لکھنے پر انھیں فخر بھی ہے۔اپنے کئی اشعار میں انہوں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے۔ان کا شجرۂ تلمذ بھی اردو کے نازک خیال شاعر مومنؔ سے جا ملتا ہے۔وہ بہ زبانِ خود کہتے ہیں:

حسرتؔ یہ وہ غزل ہے جسے سُن کے سب کہیں
مومنؔ سے اپنے رنگ کو تو نے ملا دیا
غالبؔ و مصحفیؔ و میرؔ و نسیمؔ و مومنؔ
طبعِ حسرتؔ نے اٹھایا ہے ہر استاد سے فیض

عشق میں غمِ جاناں کا درد عجب لطف رکھتا ہے۔ حسرتؔ کی غزل میں اسی درد نے غم کی زیریں لہریں پیدا کیں ہیں اور ہلکا ہلکا سوز و گداز بھی۔لیکن وہ کبھی ناامید نہیں ہوتے اور نہ ہی وہ اپنے قاری کو مغموم کرتے ہیں۔یہی بات ان کی غزل کو اوروں سے مختلف بناتی ہے:

گزاری عمر شغلِ عاشقی میں مرحبا حسرتؔ
نہ پاس آنے دیا غم ہائے بے پایانِ دنیا کو

قصۂ شوق لکھوں درد کا افسانہ کہوں!!
دل ہو پہلو میں تو اس شوخ سے کیا کیا نہ کہوں
اگر چہ میں ہمہ تن درد ہوں ولے حسرتؔ
کوئی جو پوچھے کہاں ہے؟ بتا نہیں سکتا
عشاق کے دل نازل، اس شوخ کی خُو نازک
نازک اسی نسبت سے ہے کارِ محبت بھی
رکھتے ہیں مرے دل پر کیوں تہمتِ بے تابی
یوں نالہ مضطر کی، جب مجھ میں ہو، قوت بھی
اے شوق کی بیتابی وہ کیا تری خواہش تھی
جس پر انہیں غصہ ہے، انکار بھی، حیرت بھی

حسرتؔ کی شخصیت بھی بڑی پہلو دار تھی۔وہ بہ یک وقت شاعر بھی تھے، تنقید نگار بھی۔صحافی بھی تھے، سیاست دان بھی اور مجاہد آزادی بھی۔وہ جمعیت علما کے رکن بھی تھے اور مسلم لیگ کے حامی بھی۔انھوں نے کانگریس کا پرچم بھی لہرایا اور کمیونسٹ پارٹی کی بنیاد بھی رکھی۔یہی وجہ ہے کہ جب حسرتؔ نے سودیشی تحریک کو اپنایا اور علی گڑھ میں ایک دوکان بھی کھولی تو شبلی نعمانی نے ان سے کہا:

''تم آدمی ہو یا جن، پہلے شاعر تھے، پھر پالیٹیشین بن گئے اور اب بنئے بھی ہو گئے!'' 4

لیکن ان سب سے مختلف ان کا ایک اور روپ بھی تھا۔۔۔اور وہ تھا' سچے عاشقِ غزل کا روپ۔جس نے اردو

www.urduacademyts.com

غزل میں ان کی ایک خاص انفرادیت قائم کردی تھی۔اسی انفرادیت سے ان کا رنگِ تغزل نمایاں ہوا۔جدید اردو غزل میں صحیح معنوں میں تغزل کا رنگ حسرتؔ نے بھرا ہے۔غزل کے تعلق سے ان کا ایک خاص نظریہ بن گیا تھا کہ صنفِ غزل صرف اور صرف عاشقانہ شاعری کے لیے موزوں ہے بلکہ یوں کہنا درست ہوگا کہ عاشقانہ نہیں فاسقانہ شاعری کے لیے موزوں ہے۔اپنی طبیعت کی مناسبت سے اس لیے انھوں نے صرف غزل نگاری میں طبع آزمائی کی۔وہ بھی ان حالات میں جب کہ اردو غزل اپنے زوال کے دور سے گزر رہی تھی۔ہر طرف اس کی گردن زدنی کے مطالبات کئے جارہے تھے اوراس کی تنگ دامنی کا رونا رویا جارہا تھا۔حسرتؔ نے ایسے خشک اور پُر آشوب دور میں نہ صرف غزل کی حمایت کی بلکہ اس کی آبیاری اور بازیافت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔بلا شبہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ نئی غزل کے اِحیا کے علمبردار تھے:

تو نے حسرتؔ یہ نگالا ہے عجب رنگِ غزل
اب بھی کیا ہم تری یکتائی کا دعویٰ نہ کریں

ہمہ تن صرف' ہوشیاریِ عشق
کچھ عجب شئے ہے' بے خودی دل کی

ان سے کچھ تو ملا' وہ غم ہی سہی
آبرو کچھ تو' رہ گئی دل کی

مر مٹے ہم' نہ ہو سکی پوری
آرزو پوری ایک بھی دل کی

حسرتؔ کی غزل میں ایک طرح کی ذہنی وقلبی گدگدی ہے جو عشق کی ہنگامہ خیز لہروں کو جنم دیتی ہے۔حسرتؔ کی غزل میں نمایاں خوبی یہ ہے کہ انھوں نے اپنے دل کی بات بیان کرنے تشبیہ،استعارہ یا کنایہ وغیرہ کا زیادہ سہارا نہیں لیا۔حسرتؔ کی غزل میں استعارے،تشبیہات کے بغیر محبوب کی مختلف اداوں کی تصویریں ملتی ہیں۔وہ آسان اور سہل الفاظ کا استعمال کرکے معشوق کے ناز وانداز کو یوں بیان کردیتے ہیں کہ میرؔ کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔حسرتؔ کے ان اشعار میں شورشِ عشق کی موجیں دیکھئے کس طرح ڈوبتی ابھرتی ہیں:

پڑھ کے تیرا خط،مرے دل کی عجب حالت ہوئی
اضطرابِ شوق نے اک حشر برپا کردیا

اب نہیں دل کو کسی صورت کسی پہلو قرار
اس نگاہِ ناز نے کیا سحر ایسا کردیا

بزمِ اغیار میں' ہر چند وہ بیگانہ رہے
ہاتھ آہستہ مرا پھر بھی دبا کر چھوڑا

آئینے میں وہ دیکھ رہے تھے بہارِ حسن
آیا مرا خیال تو شرما کے رہ گئے

ہجر میں پاس مرے اور تو کیا رکھا ہے
اک تیرے درد کو پہلو میں چھپا رکھا ہے

www.urduacademyts.com

حسرتؔ نے عشق کے سچے جذبات کو غزل کے پیمانے میں بغیر کسی تکلف اور تصنع کے پیش کیا ہے۔ حسرتؔ نے جو عشق کا تصور غزل میں داخل کیا وہ روایتی غزل کے مقابل بہت زیادہ صحت مند، صالح اور توانا تھا۔ انھوں نے رو بہ زوال اردو غزل کی رگوں میں تازہ اور توانا خون دوڑایا' جس کے نتیجے میں غزل ایک متوازن ارضیت اور ایک نئے جہانِ معنی سے آشنا ہوئی۔ اسی رنگ نے انھیں امام المتغزلین اور رئیس المتغزلین جیسے القاب سے نوازا۔ حسرتؔ نے عشق کے متنوع تجربات اور محسوسات کے لیے غزل کے دروازے کھول دیے۔ غزل میں ارضی اور جنسی عشق کی روایت جو غالبؔ، مومنؔ، سے ہوتی ہوئی داغؔ تک پہنچتی ہے اسے حسرتؔ نے نہ صرف ایک توانا اور صحت مند روپ دیا بلکہ حسرت نے عشق کو بازار سے نکال کر گھریلو فضا سے آشنا کیا۔ حسرتؔ کی غزل میں جنسیت کا بھی دخل ہے لیکن انھوں نے پاکیزگی کو کبھی مجروح نہیں ہونے دیا۔ خواجہ احمد فاروقی نے کسی مضمون میں خوب کہا ہے کہ 'حسرت کی جنسی شاعری میں ایک تقدس اور طہارت ہے جس کی مثال اردو شاعری میں بہت کم ملتی ہے'' اس کے ثبوت میں کئی اشعار پیش کیے جا سکتے ہیں۔ جن میں جنسیت تو ہے لیکن پاکیزگی اور پاکدامنی کہیں مجروح نہیں ہوتی۔ اس میں میرؔ کا سا انداز پایا جاتا ہے:۔

دل میں کیا کیا ہوسِ دید بڑھائی نہ گئی
روبرو ان کے مگر آنکھ اٹھائی نہ گئی

وصل میں اُن کے' قدم چومیں گے
وہ بھی گر' اُن کی اجازت ہوگی

یہ کیا اندھیر ہے اے دشمنِ اہلِ وفا تجھ سے
ہوس نے کام جاں پایا' محبت شرم سار آئی

رنگ سوتے میں چمکتا ہے طرح داری کا
طرفہ عالم ہے ترے حسن کی بیداری کا

حسرتؔ کی غزل میں ہم اکثر دیکھتے ہیں کہ وہ محبوب سے ملاقات کے متمنی ہیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ وصالِ یار وجہِ سکون ہوتا ہے۔ لیکن تجربے نے محبوب سے ملاقات کے بعد ان کے خیال میں تبدیلی پیدا کی اور وصالِ محبوب کے بعد وہ یہ کہنے لگے:۔

بڑھ گئیں ہیں تم سے تو مل کر اور بھی بے تابیاں
ہم یہ سمجھے تھے کہ اب دل کو شکیبا کر دیا

اب نہیں، دل کو، کسی صورت، کسی پہلو قرار
اس نگاہ ناز نے کیا سحر ایسا کر دیا

بلکہ اک جگہ تو انھوں نے اس خیال کی تردید کر دی ہے کہ وصالِ یار کے بعد کوئی غم' کوئی بے چینی' باقی نہیں رہتی۔ حسرت کا فلسفۂ عشق یہ کہتا ہے:۔

سب غلط کہتے ہیں، لطف یار کو وجہِ سکون
درد دل اس نے تو حسرتؔ اور دونا کر دیا

www.urduacademyts.com

پڑھ کے تیرا خط مرے دل کی عجب حالت ہوئی
اضطراب شوق نے' اک حشر برپا کردیا

حسرتؔ کی غزل سرتاپا عشقِ مجازی کی غماز ہے جس میں جرأتؔ کی طرح تہذیبی گراوٹ ہے اور نہ وہ مومنؔ کی طرح ہجر و وصال کے جھولوں میں جھولتی ہے۔ حسرتؔ کی غزل میں' ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ قاری کو کبھی مایوس اور غمگین نہیں ہونے دیتے۔ وہ زندگی کے امکانات پر یقین رکھتے ہیں کیونکہ ان کو محبت کے ہر چَر کے میں سنبھالا دینے والی چیز خود محبت بن جاتی ہے۔ عشق کی اس قوت کو حسرتؔ کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

قوتِ عشق بھی کیا شے ہے کہ ہو کر مایوس
جب کبھی گرنے لگا ہوں تو سنبھالا ہے مجھے

حسرتؔ نے اپنی غزل میں عشق کا ایک صاف ستھرا تصور پیش کیا۔ انھوں نے اپنے جذبات ومحسوسات کی صداقت کو عشق کی پاکبازی اور شگفتگی میں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی تخلیقی حس میں جمالیات کو بڑا دخل رہا ہے۔ ان کی غزل میں ایک نئی طرح کی شگفتگی، دلبستگی اور بے ساختگی ہے۔ ان کے کلام کا بڑا حصہ غنائیت کے کیف و سرور میں ڈوبا ہوا ہے۔ یہی نہیں حسرتؔ کی غزل میں قول وعمل کی ہم آہنگی کا کمال بھی نظر آتا ہے۔ ان کے دل میں کوئی چور نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ کوئی بات کہنے میں عار محسوس نہیں کرتے۔ حسرتؔ کا اسلوبِ نگارش پُرکشش ہے۔ اسلوب کی جدت' سحر کی سی تاثیر اور مقناطیسی کشش رکھتی ہے۔ یہی چیز خوبصورتی سے قاری کے ذہن پر دیر پا اثر چھوڑتی ہے۔ حسرتؔ کی زبان و بیان کو ان کی شاعری کی مقبولیت کے اسباب میں شمار کرنا بے جا نہ ہوگا۔ ان کا کلام سادہ ہونے کے باوجود بے حد پُر اثر ہے۔ وہ محبت کے نازک ولطیف جذبات اور ان کے اُتار چڑھاؤ کی تصویریں اس طرح کھینچتے ہیں کہ وہ بالکل سچی اور جاندار معلوم ہوتی ہیں۔ الغرض حسرتؔ کی غزل اپنے قاری کو ایک ایسے جہانِ عشق کی پُرکیف فضا کا حصہ بنادیتی ہے جس کی کشش ومقناطیسیت سے وہ باہر نکلنا نہیں چاہتا اور ایسا کیونکر کرے کہ:۔

عشق سے تیرے بڑھے کیا کیا دلوں کے مرتبے
مہر ذروں کو کیا قطروں کو دریا کردیا

شورشِ عاشقی کہاں اور مری سادگی کہاں
حسن کو ترے کیا کہوں، اپنی نظر کو، کیا کروں

☆☆☆

ڈاکٹر شیخ محبوب (محبوب ثاقب)
اسوسی ایٹ پروفیسور ریسرچ گائڈ شعبہ اردو
شیواجی کالج' اودگیر' ضلع لاتور
Cell:7588977543

مضامین

www.urduacademyts.com

طلباء کی تعلیمی تحصیل اور ہم نصابی سرگرمیوں کی اہمیت

تعلیم کا مقصد کسی بھی فرد کی کلی شخصیت سازی ہے۔ یہ ترقی کسی بھی شخصیت کے جسمانی، ذہنی، جذباتی، جمالیاتی، سماجی اور ثقافتی زوایوں سے دیکھی جاتی ہے۔ کسی بھی فرد واحد کی ان تمام فروغ کیلئے ضرورت اس بات کی ہے کہ مختلف سرگرمیوں کو کلاس روم کے اندر اور باہر منعقد کیا جائے۔ یہ سرگرمیاں جیسا کہ کھیل، بھاگ دوڑ، گلوکاری، رقص، مصوری، مختلف مشاغل وغیرہ ہیں۔ یہ صحت مند سرگرمیاں ذاتی اظہار اور کلی طور پر شخصیت کی ترقی کیلئے موثر ہیں۔ قبل ازیں جب کبھی نصاب کے بارے میں تعلیمی نظام میں غور وخوص کیا جاتا تھا کہ ان سرگرمیوں کو نصاب کیلئے اہم قرار نہیں دیا جاتا تھا۔ روایتی طور پر نصاب میں ان سرگرمیوں کو غیر نصابی سرگرمیوں کی حیثیت سے جانا جاتا تھا۔ تاہم اب جدید ماہرین تعلیم نے ان سرگرمیوں کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اسے نصاب کا اہم اور اٹوٹ حصہ قرار دیا۔

یہ سرگرمیاں جنہیں اسکولوں کی جانب سے ترتیب دیا جاتا ہے جو روزمرہ کی تعلیمی سرگرمیوں کے علاوہ ہیں۔ ان سرگرمیوں میں حصہ لینے کے باعث طلبہ کو آزادنہ برتاؤ سیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ یہ سرگرمیاں ایمانداری اور تعاون کی خصوصیات کی ترقی کیلئے مددگار ہوتی ہیں۔ یہ سرگرمیاں تعلیم کیلئے بہت ہی اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ لہذا، ان تمام سرگرمیوں کو کلاس روم کے باہر منعقد کیا جاتا ہے تاہم یہ نصاب کا اہم اور لازمی حصہ ہوتی ہیں اور انہیں ہم نصابی سرگرمیوں سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اسکول کا بنیادی اور اہم مقصد طلبہ کے کردار، ذہانت اور جسمانی صلاحیتوں کو ترقی دینا ہوتا ہے اور اسکول سے امید کی جاتی ہے کہ وہ انہیں کلی طور پر اس بات کی تربیت دے کہ وہ انسانی زندگی کے اہم اور بڑے کاموں کو کامیابی سے انجام دے سکیں اور بہتر شہری بن سکیں۔ معیاری تدریس واکتساب اور حقیقی معلومات، اچھی اور بااثر ہوں اسی وقت ثابت ہوسکتی ہیں جب یہ تمام ضروری صلاحیتوں اور ایک متوازن شخصیت کو تیار کرسکیں۔

تعلیم کے ساتھ ہم نصابی سرگرمیاں بھی شخصیت میں ہمہ جہت ترقی کیلئے مددگار ہوتی ہیں۔ ہم نصابی سرگرمیاں طلبہ میں کئی اہم اقدار پیدا کرتی ہیں۔ یہ طلبہ اور اساتذہ پر منحصر کرتا ہے کہ وہ ان اقدار کو کیسے بہتر تدریس واکتساب اور طلبہ کیلئے روبہ عمل لاتے ہیں۔ طلبہ جسمانی سرگرمیوں میں حصہ لیتے ہیں جو ان کی جسمانی صحت کیلئے معاون ثابت ہوتی ہیں اور طلبہ کو پرجوش بناتی ہیں۔ نفسیاتی ضرورتیں بھی ہم نصابی سرگرمیوں سے ہی حاصل ہوتی ہیں۔ نفسیاتی ضرورتیں جیسا کہ جذبات، ذاتی دعوے، جنسی خواہشات اور تجسس وغیرہ کی تربیت کو بھرپور طور پر انہی سرگرمیوں سے رخ دیا جاسکتا ہے۔ نظریاتی کاموں کا ایک بڑا حصہ جیسا کہ جغرافیہ اور سائنس وغیرہ میں صرف Tours & Visits اور قدرتی علوم پر ہی اکتفا کرسکتا ہے۔ زائد از نصابی سرگرمیاں شہری اور جمہوری اقدار کو ذہن نشین کرنے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں جس میں خود پر قابو اور مختلف تقاریب اور تہواروں کا انعقاد کروانا وغیرہ شامل ہیں۔ ہم نصابی سرگرمیاں

www.urduacademyts.com

ساتھ ہی ایک بااثر پلیٹ فارم ہے جو اہم اقدار کو اپنے اندر جذب کرنے میں مددگار ہے جس میں سماجی، جمالیاتی، ثقافتی، گھومنا پھرنا اور ڈسپلین وغیرہ طلبہ میں پیدا کرنا۔

ہم نصابی سرگرمیوں یا اضافی نصابی سرگرمیوں یا پھر غیر نصابی سرگرمیوں کے بارے میں جدید تعلیمی مفکرین اور دیگر افراد کے بیانات کچھ اس طرح ہیں:

وہ سرگرمیاں جنہیں اسکول یا کالج کی جانب سے تیار یا پھر مسلمہ قرار دیا جاتا ہے تعلیمی نظام کا حصہ نہیں سمجھا جاتا مگر تعلیمی نظام کا ضروری حصہ بھی قرار دیا جاتا ہے۔ ہم نصابی سرگرمیاں بشمول کھیل کود، اسکول بیانڈ کے کھیل، طلبہ کے اخبارات وغیرہ ہیں۔ انہیں بھی 'اضافی نصابی سرگرمیوں' کے تحت ہی گردانا جاتا ہے ہے وہ سرگرمیاں ہیں جنہیں یومیہ تعلیمی کورس کے باہر کیا جاتا ہے وہ سرگرمیاں جنہیں عام طور پر ڈیوٹی یا ملازمت کے باہر سمجھا جاتا ہے ان کو آپ اضافی کلاس سرگرمی سے تعبیر کرتے ہیں، یہ وضاحت انٹرنیشنل ڈکشنر آف ایجوکیشن (1977) میں بیان کی گئی۔

بھاٹیا (1996) کے مطابق ہم نصابی سرگرمیوں کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ وہ سرگرمیاں جنہیں کلاس روم میں سیکھنے کی صلاحیت کو بہتر بنانے کیلئے منعقد کیا جاتا ہے ساتھ ہی دیگر سرگرمیاں دونوں اندرون یا بیرون کلاس روم تا کہ بچہ کی شخصیت کو ترقی دی جاسکے۔

مختلف اقسام کی ہم نصابی سرگرمیاں:

(1) ادبی سرگرمیاں: بحث اور بات چیت، مضامین کے تحت کلبس، کالج میگزین، ڈرامٹکس، اسٹڈی سرکل، کہانیاں لکھنا، سمینار، بلند آواز میں عوام میں پڑھنا، مشاعرہ وغیرہ۔

(2) جسمانی ترقی کی سرگرمیاں: کھیل (اندر اور باہر) ایتھلیٹس، اجتماعی ڈرل، پریڈ، اسکاوٹنگ، این سی سی، اے سی سی وغیرہ۔

(3) جمالیاتی اور ثقافتی ترقی: موسیقی، رقص، مصوری، مجسمہ سازی، ڈرامہ، نمائش، فیانسی ڈریس، لوک رقص، لوک گیت، ورائٹی پروگرام۔

(4) سماجی بھلائی کی سرگرمیاں: سماجی اسٹڈی سرکل، سماجی خدمات جو کہ خصوصی حالات جیسا کہ تقاریب، پیشہ وارانہ، ثقافتی پروگرام، اسمبلی، اسکاوٹنگ یا رہنمائی۔ فرسٹ ایڈ اور ریڈ کراس سماجی سروے۔

(5) فرصت کے اوقات کی سرگرمیاں: اسٹامپ جمع کرنا، سکے جمع کرنا، کاپیاں جمع کرنا، فوٹو گرافی، پڑھنا، سلائی کڑھائی کرنا وغیرہ۔

(6) عقلی ترقی کیلئے سرگرمیاں: اسکول اور کالج میگزین، سائنس کلب، تاریخ کا کلب، دنیا کے معاملات کی سوسائٹی، مباحثے، سمینار اور بات چیت، مضمون اور کہانیاں لکھنے کا مقابلہ، شاعری سنانا، اخبار پڑھنا وغیرہ۔

(7) سماجی ترقی کی سرگرمیاں: سماج کے ساتھ تعاون، اسکاوٹنگ اور گائیڈنگ، این سی سی، این ایس ایس، کھیل اور بھاگ دوڑ، کالج کونسل کی سرگرمیاں، خصوصی تقاریب کا جشن، کالج کے مختلف دنوں کا جشن وغیرہ۔

(8) نفسی حرکی ترقی کی سرگرمیاں: ٹیلرینگ، کارپنٹری، کھلونے بنانا، صابن بنانا، موم بتی اور خوشبودار چھڑی بنانا،

مضامین

www.urduacademyts.com

ایمبر ائیڈری، سلائی کڑھائی، باغبانی، مجسمہ سازی، جانوروں کی کھال پر کام، چکنی مٹی کا کام، بنائی، بک بائنڈنگ، فوٹوگرافی وغیرہ۔

(9) ثقافتی ترقی کی سرگرمیاں: یوم تاسیس پروگرام، ٹیالنٹ شو، موسیقی اور رقص، مصوری، فیانسی ڈریس مقابلے، تقاریب کا جشن، مختلف دنوں کا جشن جس میں چوکلیٹ ڈے، روز ڈے، فرینڈشپ ڈے، ٹائی اور ساڑی ڈے، روایتی ڈے، بلیک اینڈ وائٹ ڈے، جینس اور کرتا ڈے وغیرہ۔

(10) پکنک، دورہ اور تعلیمی سیر: ہائکنگ، پہاڑوں اور چٹانوں پر چڑھائی، میوزیموں کا دورہ، زو پارک، اکیوریم، پلانیٹوریم، نہرو سائنس سنٹر، قدرتی پارک، نمائشوں کا دورہ، بینک کا دورہ، پوسٹ آفس، اسپتال، پولیس اسٹیشن، اسٹاک ایکسچینج، ایل آئی سی آفس، سرکاری آفسوں یا منتریلایا، ہوائی اڈے، بندرگاہ کا دورہ وغیرہ شامل ہے۔

(11) شہری اہمیت کی حامل ترقی کی سرگرمیاں: سماجی، مذہبی اور قومی تقاریب کا جشن، اسکول، پارلیمنٹ کے انتخابات، کوآپریٹیو اسٹورز، صفائی کا عمل، ایڈز کے تعلق سے شعور آگہی پروگرام، نشہ، شراب اور دیگر کے خراب نتائج پر پروگرام، عالمی ماحولیاتی ڈے پر پروگرام، ماحول کے تحفظ پر پروگرام وغیرہ۔

یہاں یہ نوٹ کیا جانا لازمی ہے یہ تمام سرگرمیاں کسی ایک مقصد کے تحت نہیں کی جاتیں بلکہ یہ ہمہ مقصد کے تحت ہوتی ہیں جو کہ کسی بھی فرد کی شخصیت کی ہمہ جہت ترقی میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔

اسکولوں میں ہم نصابی سرگرمیوں کی اہمیت: اعلیٰ سطحی تعلیمی مفکرین جیسا کہ روزیو، اسپینسر، ڈیوی ان سب نے ہم نصابی سرگرمیوں کو اسکول کی لازمی سرگرمیوں میں شامل کرنے پر بہت اہمیت اور زور دیا۔ ان کے مطابق ہم نصابی سرگرمیاں طلبہ کی زندگی کیلئے بہت ہی اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ گاندھی جی نے ''بنیادی تعلیم'' کا خیال 1938 میں پیش کیا اور ڈاکٹر ذاکر حسین جو کہ جامعہ ملیہ کے وائس چانسلر تھے انہوں نے بنیادی تعلیم کے نصاب کو ان خطوط پر ترتیب دیا تھا جیسے گاندھی جی نے مشورہ دیا تھا اور ہم نصابی سرگرمیوں میں اہم درجہ جسمانی، سماجی وثقافتی اور فنی سرگرمیوں کو دیا گیا۔

دی سکنڈری اسکول کمیشن (1952) نے بیان کیا کہ ''اسکول صرف ایک عام اکتساب کی جگہ نہیں ہے جہاں صرف ایک روایتی طریقہ سے دیے گئے مضامین کو پڑھایا جاتا ہے بلکہ وہ ایک زندہ اور کارکرد سماجی کام ہے جس کا مقصد طلبہ کی ایسی تربیت جسے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ'' جینے کا ہنر'' سیکھ سکیں۔ علم اور سیکھنا بلاشک وشبہ اہمیت کے حامل ہیں تاہم انہیں لازمی طور پر ایسی چیزوں کا حصول کرنا ہوگا جس میں دلچسپی ہو تب ہی وہ طلبہ کے ذہن، شخصیت اور اس کے برتاؤ پر اثر انداز ہوسکتے ہیں۔ تاہم زندگی گذارنے کا ہنر ایک وسیع تر نظریہ ہے جو صرف علم کے حصول تک محدود نہیں ہے تاہم اسے ذہانت سے ترتیب دینا ہوگا۔ اس میں عادتوں اور سماجی زندگی کو بہتر بنانے کی تربیت شامل ہے جس میں تعاون کرنے والے گروپ اس میں برداشت، اچھا برتاؤ، اخلاص، دوسروں کے احساسات اور نظم وضبط شامل ہیں۔

ہم نصابی سرگرمیوں کو اسکولی پروگرام کے مکمل حصہ میں ضروری اور اہم قرار دیا گیا ہے۔ جدید ماہرین تعلیم نے ایسی

www.urduacademyts.com

سرگرمیوں کو مکمل طور پر شخصیت کی ترقی کیلئے ضروری گردانا ہے۔ یہ سرگرمیاں موقع فراہم کرتی ہیں کہ طالب علم اپنے ذاتی خیالات اور دیگر چھپی ہوئی صلاحیتوں کا اظہار کر سکے۔ ہم نصابی سرگرمیوں کے انعقاد کی اہمیت نیچے دئے گئے ذیلی سرخیوں میں بیان کی گئی ہیں۔

جسمانی اہمیت: ہم نصابی سرگرمیاں جیسے کہ کھیل، بھاگ دوڑ، جسمانی ورزش، یوگا، آسانہ وغیرہ جسمانی صحت وتر و تازگی اور غدودی نظام کو صحیح ڈھنگ سے کارکرد رہنے کیلئے ضروری ہے۔ یہ سرگرمیاں اہم چینل کے تحت بچوں میں بھرپور طاقت فراہم کرتی ہیں۔ ان کی یہ بڑھی ہوئی طاقت انہیں تعمیری اور زرخیز کاموں میں صرف ہوتی ہے۔ جسمانی سرگرمیاں صحت مند زندگی اور اچھی عادتوں کو بچوں میں پیدا کرتی ہیں۔

نفسیاتی اہمیت: مختلف نفسیاتی ضروریات کسی بھی فرد میں ہم نصابی سرگرمیوں کے ذریعہ ہی پوری ہوتی ہیں۔ یہ سرگرمیاں جذبات، ولولہ انگیز اور وجدان، جبلت وغیرہ کیلئے مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ ان سرگرمیوں میں حصہ لینے کے باعث کسی بھی فرد کو اظہار رائے کا موقع ملتا ہے۔ یہ جبلت جیسے کہ تجسس، تعمیری، حصول اور مل جل کر رہنے وغیرہ میں اپنے خیالات کا اظہار کرنے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں اور ان سرگرمیوں کے باعث طالب علم تہذیب سے قریب تر رہتا ہے۔

تعلیمی اہمیت: ہم نصابی سرگرمیاں تعلیمی اور ادبی اقدار کی حامل ہوتی ہے۔ ادبی سرگرمیاں جیسے مباحثے، بات چیت، عوام میں پڑھنا، مجالس یا مذاکرہ، ڈرامہ وغیرہ میں۔ طلبہ مختلف طریقوں سے زبانی اظہار کرنا سیکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ کلاس اساتذہ بھی تعلیمی سرگرمیوں میں مددگار ہوتے ہیں۔ نظریاتی کام جو کہ تاریخ، زبانوں اور سائنس سے جڑے ہوتے ہیں وہ تاریخی مقامات، کتب خانہ کی سرگرمیوں اور قدرتی علوم وغیرہ سے حاصل ہوتی ہیں۔ اسکول میگزین لکھنے کے کام کی مشق کیلئے مددگار ہوتی ہے۔

اخلاقی اہمیت: یہ سرگرمیاں کسی بھی بچہ میں اخلاقی معیار کو فروغ دیتی ہیں کوئی بھی فرد یہ سیکھتا ہے کہ دوسروں کے ساتھ کیسے برتاؤ کیا جائے، حالات پر فیصلہ لے سکتا ہے، ایمانداری سے پیش آنا، اتحاد اور خود اعتمادی کا اظہار ان سرگرمیوں میں حصہ لینے کے دوران سیکھتا ہے۔ صبح کی اسمبلیوں اور اجتماعی دعا وغیرہ سے بھی ایسا ہی معیار اور کردار پیدا ہوتا ہے۔

سماجی اہمیت: ہم نصابی سرگرمیاں سماجی ذمہ داری کے لئے کسی بھی شخصیت کیلئے بہت ہی ضروری اور اہم ہوتی ہیں۔ یہ سرگرمیاں سماجی برتاؤ جس میں گروپ کے جذبات، تعاون، احساس ذمہ داری، اخلاص، وفاداری اور باہمی سمجھ بوجھ جیسے اچھے اوصاف پیدا کرتی ہیں۔ یہ سرگرمیاں کسی بھی فرد کے سماج اور اسکول کے درمیان تعلق کو سمجھنے میں مددگار ہوتی ہیں۔

اقداری اہمیت: ایسی سرگرمیاں جس میں مصوری، نمائش کا انعقاد، مختلف ورائٹی شوز، اسکول اور کالج کی تزئین نو، موسیقی اور فن وغیرہ طلبہ کے اندر اقدار کے تئیں احساس پیدا کرتی ہیں۔ یہ طلبہ کے ذہنوں میں چھپی ہوئی خوبصورتی کو اجاگر کرنے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔

شہری اہمیت: ایسی سرگرمیاں جس میں تمثیلی عدالت، تمثیلی پولیس اسٹیشن، تمثیلی اسمبلی اور بلدی اداروں کے دورے طلبہ کو

www.urduacademyts.com

ایک بہتر شہری بننے کی تربیت دیتی ہے۔ یہ سرگرمیاں انہیں حقوق کی تعلیم دیتی ہیں اور انہیں بہترین شہری کے فرائض سکھاتی ہیں۔ یہ سرگرمیاں طلبہ کو شہری زندگی اور جمہوری سماج کے بارے میں بہترین تجربات سے روشناس کرتی ہیں۔

ثقافتی اہمیت: ثقافتی سرگرمیاں ثقافتی ورثہ کے بارے میں اہم اور بہترین علم اور سمجھ دیتی ہیں۔ ہندوستان ان گنت ثقافتوں کا گہوارا ہے۔ مختلف ثقافتوں کی سرگرمیوں کو منظّم کروانے کے باعث تعلیمی ادارے مختلف ثقافتوں کا مزہ دینے میں کامیاب ہوتے ہیں اور طلبہ میں سماجی ہم آہنگی کا جذبہ پیدا کرتی ہیں۔

سیر وتفریح کی اہمیت: فرصت کے اوقات کی سرگرمیاں یا شوق سرگرمیاں تعلیمی نقطہ نظر سے بہت اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ یہ سرگرمیاں سیر وتفریح کے مواقع ان سے لطف اندوز ہونا وغیرہ سے حاصل ہوتے ہیں۔ ایسی سرگرمیاں کسی بھی فرد کی دماغی، جذباتی اور اخلاقی ترقی میں اہمیت رکھتی ہیں۔ لہذا علم اور اکتساب کیلئے دلچسپ سرگرمیاں نہایت اہم ہوتی ہیں۔

نظم وضبط کی اہمیت: جب طلبہ ہم نصابی سرگرمیوں میں حصہ لیتے ہیں وہ اصول بناتے ہیں اور اس پر عمل کرتے ہیں۔ تو ان میں نظم وضبط کے احساس پیدا ہوتا ہے اور نظم وضبط سے بھرپور زندگی کیلئے یہ احساس اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ طلبہ کو نظم وضبط کی اہمیت سیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ یہ سرگرمیاں ان میں خود پر انضباطی اور خود اعتمادی پیدا کرتی ہیں۔ تعاون، مقررہ کردہ قائد کی عزت، تربیت وغیرہ ان میں نظم وضبط کے بنیادی اصولوں کے تئیں احساس پیدا کرتی ہیں۔

ہم نصابی سرگرمیاں نہ صرف طلبہ کو چست اور بھرپور بناتے ہیں بلکہ وہ ساتھ ہی طلبہ کو خود پر کنٹرول اور صلاحیتوں کو ابھارنے کے قابل بناتی ہیں۔ یہ کئی طریقوں سے علم کے حصول کو بڑھاتی ہیں جس کا فائدہ طلبہ کے علاوہ اسکول کو بھی ہوتا ہے۔ ہم نصابی سرگرمیاں ایک اچھا پلیٹ فارم ہے جو کہ مستقبل میں دونوں سماجی اور پیشہ وارانہ طور پر قیادت کے معیار کو پیدا کرتی ہے۔ یہ طلبہ کی تعاون کرنے کی قابلیت کو پروان چڑھاتی ہیں، منظّم ہونے اور ایک دوسرے کے ساتھ تال میل رکھنے اور جس کے ذریعہ انہیں بالآخر قائدانہ صلاحیتیں حاصل ہوتی ہیں۔ زائد از نصابی سرگرمیاں شخصیت کو بھرپور بنانے میں معاون ہوتی ہیں اور یہ نفسیاتی اور سماجی تبدیلی کیلئے مددگار رہوتی ہیں۔ اسکول اور طلبہ کو زائد از نصابی سرگرمیاں بھرپور بناتی ہیں تا کہ اس کے ذریعہ طلبہ کی صلاحیتوں کو اجاگر کیا جاسکے۔ ہم نصابی سرگرمیاں شریر اور مسائل پیدا کرنے والے بچوں کیلئے بہت ہی اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔

ہم نصابی سرگرمیاں طلباء کی تعلیمی تحصیل میں کتنی اہمیت کی حامل ہیں یہ دیکھنے کے لیے ثانوی اسکول کے طلباء پر تحقیقی کام کو انجام دیا گیا۔ اس تجرباتی تحقیقی کام کا مقصد طلباء کو ہم نصابی سرگرمیوں میں شریک کرنا اور طلباء کی تعلیمی تحصیل پر ہم نصابی سرگرمیوں میں شرکت کے اثرات کو جاننا تھا۔ تجرباتی تحقیق کو انجام دینے کے لیے ثانوی اسکول کے نہم جماعت کے طلباء کو دو گروپس تجرباتی اور کنٹرول میں تقسیم کیا گیا۔ اس تحقیق سے یہ نتائج سامنے آئے کہ طلباء کی تعلیمی تحصیل پر ہم نصابی سرگرمیوں میں شرکت کے مثبت اثرات ہیں۔ معطیات کو حاصل کر کیان کا شماریاتی تجزیہ کیا گیا جس میں یہ بات عیاں

www.urduacademyts.com

ہوئی کہ طلباء میں تعلیمی تحصیل کی سطح میں ہم نصابی سرگرمیوں میں شرکت سے قبل اور بعد ازیں واضح فرق ہے۔ ماقبل ٹسٹ میں تجرباتی گروپ طلباء کی تعلیمی کارکردگی کا اوسط (95.77) اور ماقبل ٹسٹ میں کنٹرول گروپ کی تعلیمی کارکردگی کا اوسط (93.20) ہے جس کی 't' کی قدر (.639) حاصل ہوئی جوکہ 0.05 سطح پر کم ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تجرباتی اور کنٹرول گروپ طلباء کی ماقبل ٹسٹ میں تعلیمی کارکردگی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ مابعد ٹسٹ میں تجرباتی گروپ طلباء کی تعلیمی کارکردگی کا اوسط (106.27) ہے اور مابعد ٹسٹ میں کنٹرول گروپ طلباء کی تعلیمی کارکردگی کا اوسط (93.23) ہے جس کی 't' کی قدر (3.913) حاصل ہوئی ہے جوکہ 0.05 سطح پر (2.045) سے زیادہ ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہم نصابی سرگرمیوں میں شرکت کرنے سے تجرباتی گروپ میں شامل طلباء کی بہ لحاظ مابعد ٹسٹ تعلیمی کارکردگی میں بہ نسبت کنٹرول گروپ طلباء کے معنی خیز فرق ہے۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ہم نصابی سرگرمیاں طلباء کی تعلیمی تحصیل کو فروغ دینے میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔

ثانوی اسکول کے طلباء پر کئے گئے تحقیقی مطالعہ کا ماخذ یہ ہے کہ ہم نصابی سرگرمیاں طلباء میں تعلیمی تحصیل وصلاحیتوں کو بڑھانے میں مددگار ومعاون ثابت ہوتی ہیں۔ تحقیق کے نتائج یہ بھی بتاتے ہیں کہ اسکول کی سرگرمیاں اور تعلیمی تحصیل میں ایک اشتراک ہے اسکول کی کارکردگیوں میں ہم نصابی سرگرمیاں ایک اہم جز ہے۔ تعلیمی نظام پر امتحان کا غلبہ بہت ہے' اسکولوں اور یہاں تک کہ والدین اپنے بچوں کو اہم نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے لئے حوصلہ افزائی نہیں کررہے ہیں۔ طلبا کو آئندہ زندگی کے لیے مکمل طور پر تیار کرنے کے لیے نہ صرف اساتذہ بلکہ طلباء کے والدین بھی ان سرگرمیوں کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے اپنے بچوں کو ہم نصابی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے لیے حوصلہ افزائی کریں اور طلبہ کی شرکت کو یقینی بنائیں جو طلباء کی پوشیدہ صلاحیتوں اور خوبیوں کو اجاگر کرتی ہیں اور طلباء کی شخصیت کے ہمہ جہت ترقی کے لئے کافی موقع فراہم کرتی ہیں۔ لہذا اسکولوں کی ہر سطح پر چاہئے کہ طلباء کی عمر اور درجہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے مختلف قسم کی ہم نصابی سرگرمیوں کا انعقاد کرے۔ اسکولوں کو یہ یقینی بنانا چاہیے کہ طلباء کی شخصیت کے تمام علاقوں (وقوفی، نفسی، حرکی) کے تحت سرگرمیوں کا مناسب طریقے سے انعقاد کیا جائے۔ ہم اسکولوں میں جسمانی علمی، ادبی، جمالیاتی، ثقافتی، حرکی، تفریحی، سماجی سبھی طرح کی سرگرمیوں کا اہتمام اور انعقاد کرے۔ پورے مطالعہ کا نتیجہ یہ ہے کہ ثانوی اسکول کے طلبا میں ہم نصابی سرگرمیوں کی بڑی اہمیت ہے اور شرکت کے مثبت اثرات مرتب ہوتے ہیں اس لئے طلبا میں ہم نصابی سرگرمیوں کی اہمیت اور شرکت پر زور دینے کی بہت ضرورت ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر روبینہ
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ تعلیم وتربیت
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد۔
پروفیسر صدیقی محمد محمود
پروفیسر شعبہ تعلیم وتربیت
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد۔

www.urduacademyts.com

نئی قومی تعلیمی پالیسی : ایک غیر جانبدار جائزہ

غلامی کی طویل صعوبتوں سے گزرنے کے بعد ہمارے ملک بھارت کو 1947ء میں آزادی ملی۔ جب آزادی میسر آئی تو ملک کے انتظامی امور سنبھالنے کے لئے لائحہ عمل طئے کئے گئے جس میں تعلیم سے متعلق لائحہ عمل بھارت میں بسنے والے تمام مذاہب کے جذبات کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے اور وقت کے تقاضہ کو مدنظر رکھتے ہوئے تشکیل دیا گیا۔ آزاد بھارت کی پہلی تعلیمی پالیسی 1968ء میں تشکیل پائی اور دوسری مرتبہ 1986ء میں نئی تعلیمی پالیسی اندرا گاندھی اور راجیو گاندھی کے عہد میں بنائی گئی تھی۔ تاہم 1986ء کی پالیسی پر نظر ثانی 1992ء میں کی گئی جب پی وی نرسمہا راؤ وزیر اعظم تھے۔ اس کے بعد 29/ جولائی 2020ء کو کابینہ نے نئی قومی تعلیمی پالیسی کو منظوری دے دی۔ اس پالیسی کا مقصد موجودہ تعلیمی نظام میں متعدد تبدیلیاں متعارف کروانا ہے۔

نومبر 2019ء میں نئی تعلیمی پالیسی کو پارلیمنٹ کی اسٹینڈنگ کمیٹی میں پیش کیا گیا۔ جہاں اس پالیسی پر کافی بحث کی گئی۔ سائنس داں ڈاکٹر کے۔ کستوری رنگن کی قیادت والی کمیٹی نے آخر نئی قومی تعلیمی پالیسی کا ڈرافٹ وزیر برائے فروغ انسانی وسائل اور ترقی کے وزیر رمیش پوکھرال نشنک کے سپرد کردیا۔ جس کے تحت 29/ جولائی 2020ء کو کابینہ نے نئی قومی تعلیمی پالیسی کو منظوری دے دی۔ نئی تعلیمی پالیسی پر مختصر جائزہ پیش خدمت ہے۔

نئی تعلیمی پالیسی کے پیش نظر اسکولی تعلیمی نظام چار زمروں پر مشتمل ہوگا۔ پہلا زمرہ 3/سال کی عمر سے 2+3 پری پرائمری رہے گا۔ یہ چار سالوں پر مبنی ہوگا 2+2۔ دوسرا زمرہ جماعت تیسری، چوتھی اور پانچویں پر مشتمل ہوگا۔ یہ تین سالوں پر مشتمل ہوگا۔ تیسرے زمرہ میں جماعت چھٹی، ساتویں اور آٹھویں شامل رہیں گے۔ یہ زمرہ بھی تین سال کا ہوگا۔ چوتھا زمرہ 2+2 پر مشتمل ہوگا۔ اس زمرہ میں نویں تا بارہویں کلاس شامل رہیں گی۔ یعنی اسکول کی تعلیم کا دورانیہ تین سال تا 18/سال رہے گا۔ بارہویں یا انٹرمیڈیٹ کورس کو ختم کردیا جائے گا۔ اور پورے ملک میں چار زمروں پر مبنی اسکول تعلیمی نظام رائج رہے گا۔ بارہویں کے بعد اسکولی تعلیم مکمل ہوگی۔

ہائیر سکینڈری اور جونیئر کالجوں کو ختم کرکے گیارہویں اور بارہویں جماعتوں کو سکینڈری اسٹیج میں ملادیا جائے گا۔ قانون حق تعلیم پہلے چھ سے بارہ سال کی عمر تک تھا جسے بڑھا کر 3 سے 18 کی عمر تک لازمی قرار دیا گیا ہے۔ تعلیم حاصل کرنے کے موجودہ طریقہ کو تبدیل کیا جائے گا۔ بورڈ امتحانات کے ذریعے طلباء کو درحقیقت کتنی معلومات ہے اس بات کا جائزہ لیا جائے گا۔ رٹا مار کر پڑھائی کا فیصد کم کردیا جائے گا۔ طلباء کو آرٹس، سائنس اور کامرس میں تقسیم ہونا نہیں پڑے گا۔ بلکہ وہ کسی بھی شعبہ سے اپنی پسند کے مضامین کا انتخاب کرکے تعلیم حاصل کرسکیں گے۔ کالج میں داخلہ لینے کے لیے کامن انٹرنس ٹیسٹ

www.urduacademyts.com

منعقد کیا جائے گا۔ گریجویشن 3 سال کے بجائے 2 سال کا ہوگا۔ نئی تعلیمی پالیسی کے تحت تعلیم دینے کے جدید طریقوں جیسے کمپیوٹر، انٹرنیٹ ٹیکنالوجی کا بھرپور استعمال کیا جائے گا۔ سہ لسانی فارمولہ کے تحت نصاب میں تین زبانوں کی پابندی برقرار رہے گی۔ البتہ مادری زبان پانچویں یا آٹھویں جماعت تک ہی تعلیم حاصل کرنے کا ذریعہ ہوگی۔ بنیادی طور پر بھارت کے تعلیمی نظام میں ہندی یا سنسکرت کو اہمیت دی جائے گی۔ اسی طرح ترقیاتی دور کے پیش نظر کمپیوٹر کے ذریعے امتحان اور ہنر پر مبنی نصاب کی سفارش کی گئی ہے۔ بورڈ امتحانات سال میں دو مرتبہ منعقد ہوں گے۔ طلباء کو بورڈ امتحانات میں مضامین کو دہرانے کی اجازت دینے کے لیے پالیسی بنانے کی ہدایت دی گئی ہے۔ اس کے تحت طالب علم کو جس سمیسٹر میں لگتا ہے کہ وہ امتحان دینے کے لیے تیار ہے اس وقت اس کا امتحان لینا چاہئے۔ بعد میں اگر اسے لگتا ہے کہ وہ اور بہتر کرسکتا ہے تو اسے امتحان دینے کا ایک اور موقع دینا چاہئے۔

پالیسی کے تحت انڈر گریجویٹ پروگرام 3 سال سے 4 سال میں ہوگا۔ اسی طرح ایم فل کو رد کیا گیا اور ماسٹرس کے بعد پی ایچ۔ ڈی میں داخلہ دیا جائے گا۔ چھٹی جماعت سے سہ لسانی فارمولہ اختیار کیا جائے گا۔ مقامی زبانوں کے علاوہ درج فہرست زبانوں میں سے علاقائی اعتبار سے زبانیں پڑھائی جائیں گی۔ سنسکرت کو بھی شامل کیا جائے گا۔ اس پالیسی کے مطابق قدیم ہندوستانی ویدک تہذیب اور نالندہ کے طریقہ تعلیم کو رائج کرنے کی کوشش ہوگی۔ جس میں موسیقی، رقص، سرسوتی پوجا، یوگا و ہندو مذہبی تعلیمات کو لازمی طور پر شامل رکھنے کی بات بھی پالیسی میں درج ہے۔ نئی نصابی کی کتب کی تیاری اور اعلی درجہ کے تراجم کا حصول بھی پالیسی کا اہم حصہ ہے۔ رپورٹ کارڈ صرف نمبروں اور ریمارکس کے بجائے طلباء کی مہارت اور صلاحیتوں پر مبنی جامعہ رپورٹ کی شکل میں ہوگی۔ اسکول کے طلباء کو سال میں دس بیگ لیس ڈے (سرگرمیوں پر مبنی) دئے جائیں گے۔ ان دنوں میں وہ اپنی دیگر صلاحیتوں پر توجہ دیں گے۔

پالیسی کے تحت اساتذہ کو درس تدریس کے علاوہ دیگر حکومتی و ترقیاتی کاموں کی زحمت نہیں دی جائے گی۔ اساتذہ کا کام درس و تدریس اور معیار تعلیم کو بلند کرنا ہوگا۔ پرائیوٹ اور پبلک اداروں میں کوئی فرق نہیں ہوگا۔ سارے اداروں کا ایک منتظم ہوگا اور حکومت ان میں سے کسی بھی ادارے کو بورڈ آف گورنر کے ذریعہ فنڈنگ کروائیں گی۔ تمام اختیارات مرکزی حکومت کے ہاتھ میں آجائیں گے۔ راشٹریہ شکشا آیوگ، نیشنل ریسرچ فاونڈیشن جیسے اداروں کے ذمہ تعلیمی انتظام و انصرام کا کنٹرول رہے گا۔ جس کے سربراہ وزیر اعظم ہوں گے یعنی وزیر اعظم قومی تعلیمی کمیشن کی قیادت کریں گے۔

بنیادی طور پر نئی تعلیمی پالیسی کے ضوابط 55 صفحات پر مشتمل ہیں جن کو پڑھنے سے نئی تعلیمی پالیسی کے مسودے میں مثبت پہلوؤں کو جہاں روشناس کروایا گیا ہے۔ وہیں یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ اب بھارت میں تعلیمی نظام کو پرائیویٹ کیا جارہا ہے۔ ریاستی حکومت کے اختیارات کم کرکے مرکزی حکومت کے

www.urduacademyts.com

سپرد اختیارات رہیں گے۔ نئی تعلیمی پالیسی 2019ء میں ایسے اشارے بھی ملتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بڑے پیمانے پر مخصوص تحریکات اور طئے شدہ کارکنان کا ہر تعلیمی ادارے میں عمل دخل ہوگا۔ پالیسی دستاویز میں اس کا ہلکا سا ذکر کیا گیا ہے کہ کارکنان تعلیمی اداروں کے درس اور تدریس کے نظام پر نظر رکھیں گے۔ حالانکہ اس کی وضاحت نہیں ہے کہ یہ کارکنان کون لوگ ہوں گے؟ ان کے کیا اختیارات ہوں۔ دیگر یہ کہ پالیسی میں تقرری اور دیگر سہولیات کی فراہمی کا ذکر بھی ضروری تھا۔ ساتھ ہی ہر ریاست کے لیے علیحدہ ایکشن پلان ہونا چاہئے تھا۔

اسی طرح سرکاری اسکولوں کے معیار کو اتنا بلند کیا جائے گا کہ تمام سرپرست اس طرف رجوع ہوجائیں۔ لڑکیوں کی تعلیم کے لیے خصوصی فنڈس کا ذکر کیا گیا ہے۔ تعلیم بالغان پر رعایتیں اور سہولتوں کا اعلان کیا گیا ہے۔ نیشنل ٹیسٹنگ ایجنسی بنانے والے ایس ای جی ڈی کے بہترین اساتذہ کا تقرر بطور نگراں اساتذہ پر کیا جائے گا۔ نئی پالیسی کے تحت عالمی یونیورسٹیوں کو بھارت میں اپنے ادارے کھولنے کی اجازت ہوگی۔ تعلیمی میدان میں یہ ایک خوش آئند باب ثابت ہوگا جس کی وجہ سے بھارت ہی میں اعلی تعلیم حاصل کرنا مشکل نہیں ہوگا۔ ساتھ ہی نئے اور جدید کورسیس بھی متعارف ہوں گے یقیناً جس کا کسی حد تک ترقی کے ضمن میں فائدہ ہوگا۔

مختلف مذاہب کے الگ الگ زبانیں بولنے والوں کی تہذیبوں کے فروغ کو کیسے یقینی بنایا جائے گا؟ پالیسی میں اس کی وضاحت نہیں ہے۔ اقلیتوں کے تعلیمی حقوق کا تحفظ کس طرح کیا جائے گا؟ پالیسی میں اس کا ذکر بھی نہیں ہے۔ آئین کی دفعہ 30,29 اور 31 جس میں اقلیتوں کو اپنی پسند کی تعلیم دینے، تعلیمی ادارے قائم کرنے کا حق دیا گیا ہے؟ اس پر یہ پالیسی خاموش ہے اور مادری زبان کی اہمیت کو کم کیا گیا ہے۔

نئی تعلیمی پالیسی کے مسودہ کے تحت پیشہ وارانہ تعلیم کا قبل از وقت نفاذ ماہرین کے نزدیک فکر کی بات ہیں جو وہ محسوس کررہے ہیں کہ نئی تعلیمی پالیسی کے تحت بچوں کو خود کفیل بنانے کے لیے ابتدائی درجوں میں ہی پیشہ وارانہ صلاحیتوں کی مہارت پیدا کی جائے گی جس کے منفی نتائج جو کہ ڈراپ آؤٹ اور بچہ مزدوری کی شکل میں مستقبل میں سامنے آسکتے ہیں (یہ مسائل پسماندہ طبقات سے آنے والے بچوں کو درپیش آسکتے ہیں)۔ بے شک تحصیل علم کا عمل رٹا مارنے کے بجائے مہارتوں پر مبنی (Skill Based) ہونا بہتر ہے۔ مگر مہارت کی بنیاد (Skill Based) کے تحت جماعت ہفتم تک صرف مختلف مہارتوں کا تعارف اور اس کے فوائد اور مہارت کے طریقوں کی بنیادی معلومات دی جائے اور جماعت ہشتم سے اس کی عملی سرگرمیاں رکھی جائیں تو مخصوص پیشہ ورانہ مہارت حاصل کرنے کے لیے بچہ کم از کم بارہویں تک تعلیم بہرصورت جاری رکھ سکے گا۔

بھارت چونکہ رنگارنگ تہذیب کا گہوارہ ہے اس لیے جمہوری نکتہ نظر سے اسے باریک بینی سے مشاہدہ کریں تو کچھ نکات اس میں ایسے مبہم ہیں جنہیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور اس پر نیک نیتی سے مزید غور وفکر کی ضرورت ہے۔ بھارت وہ

www.urduacademyts.com

واحد ملک ہے جہاں کئی قسم کی بولیاں بولی جاتی ہیں۔ جہاں ایک طویل عرصہ غلامی سے آزاد ہونے کے لیے مختلف مذاہب اور مختلف زبانیں بولنے والوں نے ایک پلیٹ فارم پر آکر جمہوریت کے لیے لڑائی لڑی اور ان تمام زبانوں کو زبان بولنے والوں کی قربانیوں کو یکسر نظر انداز کر کے مخصوص تین زبانوں کو اہم قرار دیتے ہوئے ذریعہ تعلیم بنانے کا فیصلہ ملک کی جمہوریت کو ٹھیس پہنچا سکتا ہے۔ ملک کا قانون بھی مخصوص مذہبی امور کو اجتماعی طور پر نافذ کرنے کے اجازت نہیں دیتا ایسے میں سرسوتی پوجا، یوگا اور ہندو مذہبی تعلیمات بھی جمہوری نظام کے لیے بہت بڑا خطرہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ اگر تعلیم کو مخصوص مذہب سے رنگا جائے تو دیگر فرقہ جات کی سالمیت کو خطرہ لاحق رہے گا۔ مسودہ میں رقص و موسیقی کو ابتدائی درجوں میں لازمی قرار دے کر بچوں کو تعلیم کے مقصد سے دور کرنا ہے۔ بھارت چونکہ مختلف مذاہب کے ماننے والوں کا ملک ہے۔ جہاں مختلف فرقے اور ذاتیں ایسی بھی ہیں جہاں مذہب و اقدار کے تحت رقص و موسیقی کو معیوب سمجھا جاتا ہے اس مدعا کو بھی غور کیا جانا چاہئے۔ نئی قومی تعلیمی پالیس ہمہ پہلوؤں پر مبنی پالیسی ہے جس میں بہت سارے ادارے قائم کرنے کا ذکر ہے مگر اس کے متعلق اخراجات کی وضاحت نہیں کی گئی ہے۔ تعلیم کو ای کنٹینٹ کئے جانے کا ذکر ہے مگر دیہی علاقوں میں انٹرنیٹ کی سہولت کا فقدان برقرار ہے۔ حال ہی میں 2020ء میں رونما عالمی وباء کورونا کے باعث احتیاطی طور پر کرفیو اور لاک ڈاؤن کے ذریعہ تعلیمی اداروں کو بھی مکمل طور پر بند کر دیا گیا اور آن لائن تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا جس کا سیر حاصل ثمر نہیں مل پایا، کہیں انٹرنیٹ کے مسائل اور کہیں گھر میں ایک ہی وقت میں دو الگ الگ جماعتوں کے بچے ہونے کی وجہ سے ان کی تعلیم ایک موبائیل پر جاری رکھنا ممکن نہیں ہو پایا اور تعلیمی ادارے و اساتذہ کی جانب سے کی جانے والی انتھک کوششوں کا صد فیصد فائدہ ممکن نہیں ہو سکا۔ اس مسئلہ کو لے کر ای کنٹینٹ (E-Content) کے متعلق منظم اقدامات ہونے چاہئے۔ مادری زبان و مقامی زبان کو اعلی تعلیم کے حصول کا ذریعہ بنانا چاہئے۔

قومی تعلیمی پالیسی 2020 کا اہم مقصد مہارتوں پر مبنی بنیادی خواندگی ہے۔ جس طرح یہ پالیسی بہت ساری تبدیلیاں لے کر آرہی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ اگر ملک کی جمہوریت کو مدنظر رکھتے ہوئے تمام زبانوں کا یکساں اطلاق کیا جائے اور ان کے فروغ کے لیے یکساں مواقع فراہم کئے جائیں اور تمام مذاہب کا یکساں احترام آئین کے تحت ملحوظ رکھا جائے تو یقیناً اس پالیسی کا نفاذ ملک کی بقاء و ترقی کی جانب ایک نئے باب کا آغاز ہوگا اور روایت کی طرح بھارت اپنی رنگا رنگ تہذیبوں کے لحاظ سے دنیا میں اپنا انفرادی مقام قائم رکھ سکے گا۔

☆☆☆

خواجہ کوثر حیات
فلاٹ نمبر 8، صفا کامپلکس، کالا دروازہ
اورنگ آباد 431001 (مہاراشٹرا)
موبائل 9373193908

www.urduacademyts.com

آزادی سے پہلے حیدرآباد کے نقاد اور ان کی تنقیدی خدمات

آزادی سے پہلے جن ادیبوں نے اُردو تنقید کی روایت کو مستحکم بنایا ہے ان میں سے چند اہم نام یہاں قابل ذکر ہیں ۔ کریم الدین خان عطارد، مولوی نصیر الدین ہاشمی ، شیخ چاند، ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ ، عبدالقادر سروری اور عزیز احمد وغیرہ۔ یہ وہ ادیب ہیں جنہوں نے اردو تنقید کی دنیا میں ایسا مقام حاصل کیا ہے کہ ان کا نام سنہری حروف میں لکھا گیا ہے۔ان میں سے بعض نے آزادی کے بعد بھی اردو تنقید لکھی مگر یہاں صرف آزادی سے قبل چند معروف نقادوں پر روشنی ڈالی جائے گی اور ان کی تنقیدی خدمات کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی جائے گی جیسے:

۱۔جناب محمد کریم الدین خان: جناب محمد کریم الدین خان صاحب ۱۲ر ربیع الاول ۱۲۹۰ھ چہارشنبہ حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئے۔ حیدرآباد کی سرزمین میں جاگیر دار خاندان سے تعلق رکھنے والے علم دوست اور ادب نواز شخصیت کی حیثیت سے محمد کریم الدین خان عطارد کا شمار ہوتا ہے ۔ان کی تنقیدوں کا سلسلہ حیدرآباد سے شائع ہونے والے رسالہ ''شہاب'' کے ایک کالم سے شروع ہوا اور انہوں نے شاعری ہی نہیں بلکہ نثر نگاری پر بھی تنقید کا سلسلہ شروع کیا۔ جب فانی بدایونی کا مجموعہ کلام '' باقیات فانی '' شائع ہوا تو عطارد نے اس شعری مجموعے فانی بدایونی کے اور دوسرے مجموعے کلام ''عرفانیات فانی'' پر بھی تنقید کا سلسلہ شروع کیا لیکن فانی کے انتقال کے بعد ان کے کلام پر تنقید نہیں کی۔ ماہنامہ ''شہاب'' کے خصوصی کالم ''نقد و نظر'' کے ذریعہ انہوں نے تنقید کا آغاز کیا۔ان کی تنقید کی شروعات ۱۹۳۵ء سے ہی اپنے وجود کا ثبوت دیتی ہے ۔عطارد کے بھتیجے نواب نورالدین خان صاحب نے ''نقد و نظر'' جیسی کتاب لکھ کر نہ صرف ان کی ۵۸ تنقیدوں کو یکجا کیا ہے بلکہ سوانحی حالات بھی پیش کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ حیدرآباد کے منفرد اور اولین نقاد کا سہرا ان کے ہی سر پر ہے۔مگر کسی بھی محقق اور نقاد نے محمد کریم الدین خان عطارد کے کارناموں کی طرف توجہ نہیں دی ۔اس عظیم نقاد نے اس دار فانی کو ۱۹۶۶ء میں لبیک کہا۔

جناب عطارد نے ۱۹۳۶ء سے ہی اپنی تنقید کی روایت کو فروغ دینا شروع کر دیا تھا۔اس دور تک حیدرآباد میں ترقی پسند تحریک کا آغاز نہیں ہوا تھا۔انہوں نے سب سے پہلی تنقید '' دکنی یوسف زلیخاء '' پر کی جو رسالہ ''شہاب'' کی خورداد ۱۳۴۵ھ، بمطابق اپریل ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی۔ان کی دوسری تنقید محمد عبدالعزیز غوثی عثمانیہ کی نظم '' آتشیں منظر'' پر شائع ہوئی جو ۱۳۴۶ھ اور اگست ۱۹۳۷ء کی نمائندگی کرتی ہے۔انہوں نے سکندر علی وجدؔ اور مخدومؔ محی الدین کی نظموں پر بھی تنقیدی رائے ظاہر کی اور ان کے شعری سرمایہ میں موجود فن اور زبان و ادب کی غلطیوں کی طرف نشاندہی کی۔ اس کے علاوہ جب سید علی حیدر نظم طباطبائی نے ''شرح غالبؔ'' تحریر کی تو نظم طباطبائی کی اس شرح پر باضابطہ تنقیدی مقالہ عطارد نے کتابی سائز کے

www.urduacademyts.com

دس صفحات پر پیش کیا جو فروری ۱۹۳۸ء کی نمائندگی کرتا ہے۔ علی منظور حیدرآباد کے مشہور شاعر تھے ان کی نظم ''جاسوس دوست'' پر عطارد کا تبصرہ ستمبر ۱۹۳۸ء کے ماہنامہ شہاب میں شائع ہوا۔اس طرح شاعروں کے کلام ان کی نظموں اور مرتبین کی کتابوں پر تنقیدی جائزہ کی روایت سب سے پہلے حیدرآباد کی سرزمین میں جناب محمد کریم الدین خان عطارد نے رکھی اس لیے حیدرآباد کی تنقیدی تاریخ میں ان کے تنقیدی رویہ کی وجہ سے تعریف کی جانی چاہیے۔ محمد کریم الدین خان عطارد نے جگر مرادآبادی کی ایک مکمل غزل پر اپنی تنقیدی رائے پیش کی ہے۔ ہر شعر کو الگ الگ لکھ کر تفصیل کے ساتھ اپنا تنقیدی نقطہ نظر پیش کیا ہے۔مثلاً اس شعر کو دیکھیں:

جو شایان نگاہ یار بھی ہے
وہ دل ثابت بھی ہے سیار بھی ہے

''لفظ ''دل'' کا مقام پہلے مصرعہ میں ہونا چاہیے یعنی جو دل نگاہ یار کے شایان ہے۔ قطع نظر اس کے مصرعہ اولیٰ میں لفظ ''بھی'' قطعاً صحیح نہیں۔شعرائے متقدمین ومتاخرین نے دل کی بہت سی صفات وتشبیہات استعمال کئے ہیں مگر دل کو ثابت وسیار کسی نے نہیں کیا یا ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ ثابت وسیار سے وجہ شبہ ان کی صفت ثبات وسیر ہے۔تو کیا متلون دل ہی شایان نگاہ یار ہوتا ہے۔''

جناب عطار نے جگر مرادآبادی کی اس غزل کا بغور مطالعہ کر کے گہرائی وگیرائی ساتھ ہر شعر کو اپنی تنقیدی خیال سے روشناس کیا۔انہوں نے اس شعر کے لفظ ''دل'' اور ''بھی'' کے نقص کو اجاگر کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ ان میں تنقید کا مادہ کوٹ کوٹ کے بھرا ہوا ہے۔ اسی طرح مضمون نگار اسفندار نے مضمون 'اقبال کے کنایے'' میں کنایے کی بات چھیڑی فرماتے ہیں،قدیم وجدید شاعری میں مابہ الامتیاز کس چیز کو قرار دیا گیا ہے ،ذرا اس کو بھی دیکھ لیجیے:

''کنایہ کے پردے میں محبوب کے خدوخال اور ظلم و ستم کا تذکرہ ہوتا تھا۔ مثلاً محبوب نہیں سرو ہے شمشاد ہے قاتل ہے ترک ہے اس کی پلکیں نہیں تیر وسناں ہیں،اس کی نگاہیں نہیں تیر ہیں۔''

محمد کریم الدین خان عطارد نے اس کے جواب میں یوں لکھا:

''اگر یہ الفاظ کنایہ ہیں تو خدارا یہ بتایئے کہ تشبیہ کسے کہتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ لائق مضمون نگار کے عندیہ میں '' تغزل وتصوف'' پرانی شاعری سیاسی اور قومی نظمیں جدید شاعری ہے۔مگر بات یہ ہے کہ شاعری پرانی ہو یا نئی غزل ہو یا قصیدہ،مثنوی ہو یا خمسہ،سیاسی نظم ہو یا قومی مسدس۔ جب تک اس میں زبان کی خوبی،بیان کی خوش اسلوبی،مضمون کی رفعت بندش کی سلاست نہ ہو،محض کلام منظوم پر ادب وشعر کی تعریف صادق نہیں آسکتی۔''

عطارد کی تنقیدی رائے تشبیہ اور کنایہ میں فرق واضح کرتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ کنایے سے بھی ہمیں متعارف کراتے ہیں۔اس کتاب میں جہاں جگر مرادآبادی کی پوری غزل پر عطارد نے رائے قائم کی ہے وہیں حسرت موہانی کی غزل پر بھی ایک پورا مضمون لکھا ہے۔جس میں انہوں نے ہر

www.urduacademyts.com

شعر پر الگ الگ تنقیدی رائے پیش کی ہے جیسے:

ہر آنکھ سے پوشیدہ نہیں حالِ محبت
ہر آنکھ کو یہ حال دکھایا نہیں جاتا

''ہر آنکھ سے حالِ محبت پوشیدہ نہیں''، یعنی ہر آنکھ حالِ محبت سے واقف ہے دیکھ رہی ہے لہٰذا مصرعہ ثانی بے کار ہو گیا، ''حالِ محبت''، جس سے پوشیدہ نہیں اس سے کہنا کہ ''حالِ محبت تجھ کو دکھایا نہیں جاتا'' بے معنی بات ہے۔ آنکھ کو دکھانا اردو بول چال نہیں! آنکھ خود ہی دیکھتی ہے ''آنکھ کو دکھانا'' صحیح نہیں۔''

۲۔ مولوی نصیرالدین ہاشمی: مولوی نصیرالدین ہاشمی ۱۵ر مارچ ۱۸۹۵ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ ان کا پورا نام نصیرالدین محمد عبدالباری تھا۔ ان کے والد مولوی عبدالقادر منصف عدالت اور رجسٹرار بلدہ رہے۔ نصیرالدین ہاشمی نے دارالعلوم حیدرآباد سے منشی و مولوی عالم اور مدراس یونیورسٹی سے منشی فاضل کی سند حاصل کی۔

مولوی نصیرالدین ہاشمی کا شمار ہندوستان کے صف اول کے محققین میں ہونے کے ساتھ ساتھ دکنی ادب کے اولین بنیادی محققین میں ہوتا ہے۔ ان کی گراں قدر تحقیقات، تصنیفات اور تالیفات کو اردو زبان و ادب میں نقش اول کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ وہ ماہر دکنیات ہونے کے علاوہ اعلیٰ پایہ کے ادیب تھے۔ نصیرالدین ہاشمی کی علمی، ادبی، لسانی، تاریخی، تحقیقی اور تنقیدی خدمات اردو ادب کا ناقابل فراموش سرمایہ ہے۔

سوانحی کوائف حذف۔۔۔۔!

مولوی نصیرالدین ہاشمی نے اپنے ایک مضمون ''حضرت خواجہ بندہؒ کی ہندوستانی شاعری'' میں خواجہ بندہ نواز کے اختلاف شدہ تخلص پر اپنے خیالات کا اظہار اس طرح سے کیا ہے:

''خواجہ صاحب کے تخلص کے متعلق یہ لکھا گیا ہے کہ ان کا تخلص یقینی طور پر شہبازؔ تھا، مگر اس کا کوئی ثبوت نہیں دیا گیا ہے کہ دراصل آپ شہبازؔ تخلص کرتے تھے کیونکہ ہم کو جو کلام ملا ہے اس میں پورا نام سید محمد حسینی اور ''بندہ'' بھی تخلص لایا گیا ہے' اس طرح یہ امر ہنوز تحقیق طلب ہے کہ آپ کا دراصل تخلص کیا تھا۔''

نصیرالدین ہاشمی اس اقتباس میں ان تمام ادیبوں کی نکتہ چینی کرتے ہیں جنہوں نے حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ کو شہبازؔ کے تخلص سے موسوم کیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ نصیرالدین ہاشمی نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ ان کے اصل تخلص پر تحقیق کی جائے اور اردو دنیا کو ان کے اصل تخلص سے متعارف کیا جائے۔

نصیرالدین ہاشمی دکنی مثنویوں کے بارے میں اپنی رائے طلب کرتے ہوئے نظر آتے ہیں:

''ردیف اور قافیہ کی سہولیت کی بناء پر مثنوی کی صنف سخن نے جو عام مقبولیت حاصل کی اور فارسی میں اس کی وجہ سے جو اعلیٰ ادب فراہم ہو گیا۔ وہ دکنی شعراء کے لیے ایک اچھا نمونہ ثابت ہوا، دکنی مثنویاں اردو ادب کے لیے ایک گراں بہا زیور ہیں زیادہ تر اسی صنف سخن میں دکنی شاعروں نے اپنے فکر و تخیل کی روئدادیں قلم بند کی ہیں۔ اس دور کے جتنے بھی شعراء کا علم حاصل ہے ان سب نے بجز چند شاذ مستثنیٰ صورتوں کو ایک یا ایک

www.urduacademyts.com

سے زیادہ مثنویاں لکھی ہیں۔"

نصیرالدین ہاشمی دکنی مثنویوں کو ادبی خزانے کا درجے دیتے ہیں اور ان مثنویوں کی اہمیت کے بارے میں بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ دکنی شعراء نے اپنے حالات وواقعات کو دکنی مثنویوں میں ہی قلم بند کیا ہے۔ نصیرلدین ہاشمی نے مضمون "وجہی مرثیہ گو کی حیثیت سے" میں وجہی کا مرثیہ "مرثیہ حضرت حسینؑ" پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے یوں لکھا ہے:

"یہ کوئی طویل مرثیہ نہیں ہے اور نہ اس میں مبالغہ اور قوت بیان کا اظہار کیا گیا ہے۔ جھوٹے قصے، تلوار کی تعریف، گھوڑے کا وصف، صبح کا سماں، جنگ دھوپ کا منظر کچھ نہیں ہے۔ اس وقت کی روزمرہ زبان میں غمِ حسین کا اظہار مقصود ہے۔"

۳۔شیخ چاند: جامعہ عثمانیہ کے ایک اہم سپوت کی حیثیت سے شیخ چاند نے اردو تحقیق میں بڑا کارنامہ انجام دیا جن کی پیدائش ۱۰ر اپریل ۱۹۰۶ء کو اورنگ آباد کے قصبہ پٹن میں ہوئی۔ انہوں نے اورنگ آباد سے تعلیم حاصل کی۔۱۹۲۵ء میں ایف اے کا امتحان کامیاب کرنے کے بعد ۱۹۲۸ء میں جامعہ عثمانیہ سے بی اے اور ۱۹۳۰ء میں ایم اے کا امتحان کامیاب کیا جب کہ ۱۹۳۲ء میں قانون کی ڈگری حاصل کی۔ ان کی مشہور کتاب "سودا" تحقیق کا اولین نقش ہے۔ حیدرآباد کے بنیاد گزار تنقید نگاروں میں شیخ چاند ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ شیخ چاند کی تصانیف میں ۱۹۳۱ء میں "ملک عنبر" ۱۹۳۲ء میں "سنت ایکناتھ" اور ۱۹۳۹ء میں "نظام الملک آصف جاہ اول" شائع ہوچکی ہیں۔ شیخ چاند کا تنقیدی کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے استاد محترم بابائے اردو مولوی عبدالحق کے لکھے ہوئے مختلف خاکوں کو جمع کرکے "چند ہم عصر" کے نام سے پیش کیا جو ۱۹۳۷ء میں انجمن ترقی اردو اورنگ آباد سے شائع ہوا۔ اس طرح ان کے تنقیدی شعور اور تحقیقی مقالے "سودا" کے تیسرے حصے میں موجود تنقیدی روش سے اندازہ ہوتا ہے کہ شیخ چاند بھی دکن کے اہم ناقدوں میں شمار ہوتے ہیں مگر ان کا انتقال کم عمری ہوگیا۔

الغرض موجودہ دور میں شیخ چاند کو محقق ہی نہیں بلکہ حیدرآباد کے ابتدائی نقاد اور ان کی تنقیدی روش میں حقیقت پسندی کی نمائندگی کرتے ہوئے یہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ جامعہ عثمانیہ کی تعلیم وتدریس کے نتیجہ میں شیخ چاند مرحوم میں تنقید کا شعور پیدا ہوا جبکہ اسی دور میں ایک اور شخصیت حیدرآباد کی سرزمین میں سرمایہ دارانہ نظام کی علمبردار اور نوابی خاندان سے تعلق رکھنے کے باوجود بھی تنقید کے میدان میں اہم کارنامے انجام دیتی ہے۔ علامہ شبلی نے حالی کی تصنیف "حیات جاوید" کا مطالعہ کرنے کے بعد اس پر اپنی تنقیدی رائے اس طرح قائم کی ہے:

"حیات جاوید کی تنقیص میں عموماً تین الفاظ کہے جاتے ہیں: یک رُخی تصویر، مدلل مداحی اور کتاب المناقب۔"

شیخ چاند نے علامہ شبلی پر اس حوالے سے اپنی تنقیدی رائے کا اظہار کچھ اس طرح سے کیا ہے:

"مولوی شبلی نے کئی سوانح عمریاں لکھی ہیں لیکن ان کی یہ رائے دیکھ کر ہمیں ان کی فن دانی پر شبہ ہوتا ہے۔ ہم صرف ایک سوال کرتے ہیں کہ کیا شبلی کی سوانح عمریاں مناقب ومحاسن

www.urduacademyts.com

کے دفتر نہیں؟ ان کی سوانح عمری میں تصویر و کا دوسرا رُخ دکھایا گیا ہے؟ شبلی کے ان تنقیدی الفاظ پر ان کے سب سے زبردست اور پُر جوش معتقد و مداح مہدی حسن مرحوم نے سب سے پہلے یہ اعتراض کیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اس کا جواب دینے سے شبلی کی سوانح عمریاں قاصر ہیں۔''

اس اقتباس میں علامہ شبلی کی لکھی ہوئی سوانح عمریوں کے متعلق بات کی گئی ہے اور شیخ چاند نے شبلی پر تنقید کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان کی سوانح عمریوں میں بھی تصویر کا ایک ہی رُخ ملتا ہے۔ وہ صرف مداح خوانی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

۴۔ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ: سید محی الدین قادری ۲۸ رمضان ۱۳۲۳ ہجری بمطابق ۷ دسمبر ۱۹۰۴ء کو حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید غلام محمد شاہ صاحب زعمؔ تھے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ کا نام تاریخ ادب اردو میں ہمیشہ زندہ و تابندہ رہے گا۔ ڈاکٹر زورؔ دکن کے وہ نامور ادیب ہیں جنہوں نے نہ صرف ہندو پاک بلکہ بین الاقوامی شہرت حاصل کی۔ وہ محقق، نقاد، سوانح نگار، افسانہ نگار، شاعر، صحافی، اعلیٰ پایہ کے استاد ہونے کے علاوہ ماہر لسانیات وصوتیات اور ماہر دکنیات تھے۔ انہیں دکنیات کا سالارِ کارواں کہا جاتا ہے۔

سوانحی کوائف حذف۔۔۔!

ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ کے چند تنقیدی تصورات راقم یہاں پیش کرنے کی جسارت کرتا ہے۔ تنقید کے مفہوم پر بات کرتے ہوئے ڈاکٹر زورؔ یوں لکھتے ہیں:

''فن تنقید اس فن کو کہتے ہیں جس میں دوسروں کی حرکات واقوال پر انصاف کے ساتھ فیصلے صادر کئے جاتے ہیں' صحیح وغلط، اچھے اور برے اور حق و باطل کے درمیان فرق کرنے، دودھ کا دودھ کا اور پانی کا پانی الگ کر دکھانے وقتیہ معتقدات اور زواتیات کو ملیا میٹ کرنے، نیز صحیح مذاق پیدا کرنے کی کوشش کو تنقید کہتے ہیں۔''

ڈاکٹر زور کے نزدیک تنقید انصاف کے ساتھ فیصلے کا نام ہے، اچھے اور برے، حق و باطل کے درمیان فرق کرنے کا نام ہے اور تو اور دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دکھانے کے ہنر کو تنقید کہتے ہیں۔ تنقید کو بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ تنقید کی اہمیت اور افادیت کو اُجاگر کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:

''یہ صرف تنقید ہی ہے جو قوموں کے محسوسات خوابیدہ کو بیدار کر دیتی ہے۔ یہ صرف تنقید ہی ہے جو غلط معتقدات اور باطل خیالات کو زبان دانوں کی ذہنیت سے محو کر دیتی ہے، اور یہ صرف تنقید ہی ہے جس کے باعث علوم وادب علوے مذاق اور رفعتِ تخیل کی خوش نما شہراہوں پر گامزن ہونے لگتے ہیں۔ پس اگر اہل اردو کو بھی اس کے مقاصد واصول سے واقف کرایا جائے تو امید ہے کہ بہت جلد اردو ادب کے تمام موجودہ نقائص کی تلافی ہو جائے گی۔''

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ کے مطابق اردو ادب سے جڑے ہر فرد کو تنقید اور تنقید کے اصولوں سے واقف ہونا چاہیے۔ واقفیت کے بعد ہی اردو ادب میں پائے جانے والے نقائص

www.urduacademyts.com

درست کئے جاسکتے ہیں۔تنقید ہی وہ چیز ہے جو قوموں اور نسلوں کو خواب غفلت سے دور کرتا ہے اور حقیقت کی طرف گامزن کرتی ہے۔ڈاکٹر زورؔ ادب کی بدعنوانیوں کو روکنے کے لیے تنقید کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرنا چاہتے ہیں۔شاید تنقید ہی وہ طاقت ہے جس سے ادب میں پائی گئی ناپاکی کو صاف اور درست کیا جاسکتا ہے۔اس حوالے سے زورؔ صاحب لکھتے ہیں:

''تنقید ادب کو تعصب اور خود غرضی کی بھینٹ چڑھانے سے بچاتی ہے، بعض ایسے انشاء پرداز بھی نکل پڑتے ہیں جو اپنے اغراض و مقاصد یا بے راہ روی کے سبب غلط معتقدات اور باطل خیالات کی علم برداری اس کمال سے کرتے ہیں کہ وہ سب محاسن معلوم ہونے لگتے ہیں۔ادب کو ادب کی حیثیت تک نہیں محدود رکھتے بلکہ کسب معشیت کا وسیلہ قرار دیتے ہیں یا اگر کسی انشاء پرداز سے ذاتی عناد و مخاصمت ہو تو اس کا اظہار اس طرح کیا جاتا ہے کہ اس کا ادبی جواب دیا جائے اور ان دونوں کے ذاتی جھگڑوں میں قوم کا ادب ناپاک ہوجاتا ہے۔ اس قسم کی تمام بدعنوانیوں کو روکنا تنقید نگاری کا ایک اعلیٰ مقصد ہے۔''

تنقید کی تعریف کرنے کے بعد اس کی اہمیت و افادیت کی وضاحت کرتے ہوئے جو عوامل و محرکات ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ صاحب نے بیان کئے وہ قابل ستائش ہیں۔اس کے علاوہ ڈاکٹر زورؔ نے ادب کی بدعنوانیوں کو روکنے کے لیے تنقید کو ہتھیار بتایا ہے۔ چونکہ ادب میں تقلیدی روش پر بہت تنقید کی گئی اور کہیں کہیں پر اس روش کو سراہا بھی گیا۔

۵۔پروفیسر عبدالقادر سروری: عبدالقادر سروری ۱۹؍اگست ۱۹۰۶ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ان کے والد کا نام حاجی محمد و سرور تھا۔عبدالقادر سروری نے ابتدائی تعلیم سرکاری مدارس میں پائی۔عبدالقادر سروری کا شمار دکن کی علمی و ادبی قدآور شخصیتوں میں ہونے کے علاوہ جامعہ عثمانیہ کے ان گنے چنے سپوتوں میں ہوتا ہے۔ جنہوں نے اپنی صلاحیتوں سے بہت کم مدت میں ہندوستان گیر شہرت پائی۔ان کے علمی و ادبی خدمات کارناموں کی فہرست بہت طویل ہے۔دکنی زبان و ادب کی انہوں نے بیش بہا خدمات انجام دیں اور اردو ادب کے تقریباً ہر گوشہ پر انہوں نے قلم اٹھایا۔تنقیدی و تحقیق ، تاریخ ادب ،ترجمہ، فن افسانہ، افسانہ نگاری، دکنیات اور لسانیات کے موضوع پر کتابوں کے ڈھیر لگادئے۔

عبدالقادر سروری کی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے ہوا۔رفتہ رفتہ انہوں نے اپنا رخ تحقیق و تنقید کی طرف موڑ لیا۔انہیں تاریخ ادب، ادبی تذکرے، اصناف ادب، تحقیق و تنقید کے علاوہ لسانیات سے بھی دلچسپی تھی۔ پروفیسر عبدالقادر سروری کا کشمیر یونیورسٹی میں ملازمت کے دوران ۱۱؍مارچ ۱۹۷۱ء کو رات میں انتقال ہوگیا اور سری نگر میں ہی تدفین عمل میں آئی۔ پروفیسر عبدالقادر سروری ایک کثیر تصانیف ادیب تھے اس حوالے سے ڈاکٹر عسکری صفدر صاحبہ نے اپنی کتاب ''دکنی ادب کے محققین و محسنین'' میں ان کی تصانیف کی مکمل تفصیل پیش کی ہے۔انہوں نے ۱۹۵۰ء کے بعد بہت ساری کتابیں لکھیں۔ عبدالقادر سروری کے دیگر ادبی کارناموں پر تفصیل سے روشنی

www.urduacademyts.com

ڈالنے کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔البتہ عبدالقادر سروری کی چند تنقیدی نگارشات کو پیش کرنے کی سعی کی جائے گی۔انہوں نے اپنی مشہور کتاب ''جدید اردو شاعری'' کے حصہ اول میں مضمون ''شعر کی تقسیم'' میں داخلی شاعری کے ضروری عناصر پر اپنی رائے یوں قائم کرتے ہیں:

'' داخلی شاعری کے چند ضروری عناصر یہ ہیں ۔ شریف جذبات اور صداقت شعاری کے علاوہ حسن اور صفائی بیان کا اس میں پایا جانا ضروری ہے تناسب اور اختصار بھی اس میں زور پیدا کر دیتا ہے۔ داخلی شاعری میں عظمت اور ہدایت انہی شاعروں کے حصّے میں آئی ہے جو ذاتی محسوسات کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ہر پڑھنے والا ان کو اپنے جذبات سمجھنے لگتا ہے۔''

عبدالقادر سروری کا ماننا ہے کہ شاعر کو ذاتی محسوسات کا استعمال کرنا چاہیے کہ قاری ان محسوسات کو ذاتی جذبات سمجھے۔شریف جذبات اور صداقت شعاری کے ساتھ ساتھ حسن اور صفائی بیان کا ہونا ضروری ہے۔ لی ریکل شاعری پر بات کرتے ہوئے سروری صاحب یوں لکھتے ہیں:

'' لی ریکل شاعری عموماً زیادہ غور وفکر کا نتیجہ نہیں ہوتی۔ بلکہ جوش جذبات اس کے ماخذ ہیں۔اسی لیے یہ فطرت انسانی کے جذباتی پہلو سے زیادہ واسطہ رکھتی ہے۔استدلال اور تفکر کو متاثر کرنا اس طرح کی شاعری کا کام نہیں ہے اس اعتبار سے غالبؔ کی شاعری، باوجود غزل کی شاعری ہونے کے، بہت کم موسیقیانہ ہے۔ہم اس کو حکمیہ شاعری کے ضمن میں جگہ دیں گے۔''

اردو شاعری اگرچہ غور وفکر کا نتیجہ ہے مگر اس کے برعکس لی ریکل شاعری قدر مختلف ہے۔عبدالقادر سروری کا مانا ہے یہ شاعری جوش وجذبات سے آراستہ ہوتی ہے نہ کہ انسانی فطرت پر منحصر ہے۔اس شاعری کا ہر ہر گز یہ کام نہیں ہے کہ فہم و ادراک کو متاثر کرے۔عبدالقادر سروری صاحب نے تنقید کے ہر گوشے پر قلم اٹھایا ہے اور بہترین آراء قائم کی ہیں۔

۶۔عزیز احمد: عزیز احمد (۱۹۱۳ء تا ۱۹۷۸ء) باپ کا نام بشیر احمد تھا۔شروع شروع میں عزیز احمد نے عثمان آبادی کے نام سے لکھا بعد میں اپنے اصلی نام سے لکھنے لگے۔ان کا خاندان کاکوری اور بارہ بنکی سے تھا لیکن ان کے والد حیدرآباد میں مقیم ہوگئے تھے۔ سوانحی کوائف حذف۔۔۔!

یہاں پر عزیز احمد کی تنقید نگاری کی چند مثالیں پیش کی جائیں گی جن سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ تنقید کے میدان میں اپنے قدم کہاں تک جمائے ہوئے ہیں۔عزیز احمد نے اپنی مشہور کتاب ''ترقی پسند ادب'' میں نفس مضمون پر بات کرتے ہوئے منٹو کو اپنے قلم کا نشانہ بنایا ہے۔وہ یوں لکھتے ہیں:

''نفس مضمون کی حد تک سب سے بڑا اعتراض منٹو پر عائد ہوتا ہے کہ اس میں انسانیت کا واضح عقیدہ کہیں نظر نہیں آتا، انسان اور انسان کی دوستی، ہمدردی، رفاقت، محبت جس پر اچھے انقلابی فلسفے کی بنیاد ہے ان کے یہاں نہیں ہے۔جنسی محبت اور کتوں کی محبت میں فرق نہیں'' ملاحظہ ہو شیرو'' انقلابی کو اگر جنون نہ ہو تو وہ خودکشی کا ارادہ ضرور کرتا ہے، دوست جمع ہوتے ہیں تو اس لیے کہ اپنے رجعت پسند مریضانہ احساسات کا اظہار

www.urduacademyts.com

کرے۔ منٹو صاحب اپنے ساتھی ترقی پسندوں سے بھی خوش نہیں ''دھواں کے پیش لفظ میں غالباً احمد علی اور رشید جہاں کی طرف اشارہ ہے''۔ ''ترقی پسند'' جو ہجو کا شاہکار ہے غالباً اردو ترقی پسند ادب کے دو بہت بالاتر نمائندوں راجندر سنگھ بیدی اور دیوندر ستیارتھی کا مذاق اُڑانے کے لیے لکھا گیا ہے۔''

اس اقتباس میں عزیز احمد لکھتے ہیں کہ منٹو کے یہاں انسانیت کا کھلا عقیدہ ناپید ہے۔ کہتے ہیں کہ منٹو کو پڑھنے کے بعد ان کے ہاں خلوص، ہمدردی، انسان دوستی جیسے اوصاف کم نظر آتے ہیں۔ ان کے مطابق منٹو اپنے ساتھیوں سے بھی رشک کرتے ہیں اور وقت آنے پر کھلے عام ہجو بھی کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں منٹو کے افسانے ''دھواں'' کا پیش لفظ اور ''ترقی پسند'' پڑھا جائے تو منٹو کی دوستوں کے ساتھ ان بنی عیاں ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ترقی پسند تحریک سے ہوئی غلطیوں پر اعتراض کرتے ہیں اور جواب میں یوں لکھتے ہیں:

''ترقی پسند تحریک نے مختصر افسانے پر اپنی ساری توجہ صرف کردی لیکن ناول سے بڑی غفلت برتی۔ اوپندر ناتھ اشک کا ایک ناول ''ستاروں کے کھیل'' شائع ہو چکا ہے۔ لیکن یہ اس وقت کا لکھا ہوا ہے جب ترقی پسندی اصطلاح ہندوستان تو کیا یورپ میں بھی رائج نہیں ہوئی تھی۔ یہ ناول اوپندر ناتھ اشک کے افسانوں کے مقابل کوئی خاص ادبی اہمیت نہیں رکھتا۔ پریم چند کی روداد بندی کے سارے نقائص اس میں موجود ہیں اور خوبیاں بہت کم ہیں۔ ایک طرح کی مریضانہ رومانیت قصہ اور کردار نگاری دونوں کو اعلیٰ فنی معیار سے گرا دیتی۔''

عزیز احمد ترقی پسند تحریک سے شکوہ کرتے ہیں کہ ترقی پسندوں نے زیادہ زور افسانے پر دے دیا اور ناول کو نظر انداز کیا۔ حالاں کہ موازنہ کرنے کے بعد اس دور کے ناول اور افسانے فن کے لحاظ سے برابری رکھتے تھے' انہوں نے اس حوالے سے اوپندر ناتھ اشک کے ناول ''ستاروں کا کھیل'' کا ذکر کیا ہے۔ کہتے ہیں یہ ناول ان کے افسانوں کے مقابل کوئی خاص ادبی اہمیت نہیں رکھتا۔ ساتھ ہی ان کے افسانے اور ناول فن کے لحاظ سے تولے جائیں تو ان کا وزن یکساں پایا جاتا ہے۔

مجموعی طور پر اگر حیدرآباد کے نقادوں کی بات کی جائے تو انہوں نے زیادہ کام دکنی ادب پر ہی کیا ہے۔ لیکن چند ایسے بھی نقاد گزرے ہیں کہ جنہوں اردو تنقید کی دنیا میں آسمان کو چھولیا ہے۔ ان نقادوں میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ اوّلیت کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اور بھی کئی نام ہیں کہ جنہوں نے اردو تنقید کی دنیا میں اپنا اہم کردار ادا کیا ہے۔ آزادی سے پہلے یہاں کے نقادوں میں جناب کریم الدین خان عطارد، مولوی نصیر الدین ہاشمی، شیخ چاند، عبدالقادر سروری، سید مبارز الدین رفعت، حفیظ قتیل، خواجہ حمید الدین شاہد وغیرہ کے نام کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان ادیبوں کا نام اردو ادب کی تاریخ میں بار بار دہرایا جائے گا اور ساتھی ان کی تنقیدی نگارشات سے اردو کے محبّ استفادہ حاصل کریں گے۔

نظیر احمد گنائی
ریسرچ اسکالر، دہلی یونی ورسٹی
7889779687,9618559318

www.urduacademyts.com

اکیسویں صدی میں اساتذہ کی تدریس میں اطلاعاتی اور ترسیلی تکنیک (آئی۔سی۔ٹی) کا کردار

اساتذہ کی تدریس وتربیت کسی بھی ملک وقوم کی تعمیر وترقی کے لئے ایک اہم ستون کی حیثیت رکھتی ہے۔کیونکہ یہ سماج کا وہ طبقہ ہے جو افرادسازی کا کام انجام دیتے ہیں اور ہر میدان کے ماہرین کو تیار کرنے میں ان کا کردار اہم ہوتا ہے۔اگر یہ نہ ہوں تو ہم نہ علوم کو فروغ دے سکتے ہیں اور نہ ہی اپنی تہذیب وثقافت کی بہتر انداز میں حفاظت کر سکتے ہیں۔کیونکہ تعلیم سے متعلق ہر شئے خواہ طلبا، اساتذہ، کتابیں، اقدار سب ایک دوسرے سے باہم مربوط ہیں۔سماج میں ہر طبقہ پر الگ الگ ذمہ داری ہوتی ہے لیکن ایک معلم پر بیک وقت بے شمار ذمہ داریاں ہوتی ہیں جیسے طلبا کو علوم سے بہرہ ور کرنا، ان کے رویہ میں تبدیلی لانا، ان میں اقدار کو فروغ دینا، انکو سماج کا بہترین فرد بنانا نیز ملک کی تہذیب وثقافت کو تعلیم کے ذریعہ منتقل کرنا وغیرہ۔اس لئے ایسے حالات میں ضرورت اس بات کی ہے کہ اساتذہ کو ان تمام علوم ومہارتوں سے واقف کرایا جائے جس کی ضرورت درس وتدریس میں ہوسکتی ہے۔

یہ بات بالکل عیاں ہے کہ دور حاضر میں ٹکنالوجی نے خوب ترقی کی ہے اور اس کے اثرات تمام شعبہ ہائے زندگی پر نظر آتے ہیں۔اور تعلیم کا میدان بھی اس سے خود کو الگ نہیں کرسکتا کیونکہ ٹکنالوجی ایسی شئے ہے جس نے علم کی اشاعت میں وہ کردار ادا کیا ہے جو آج تک کسی اور ذریعہ سے نہیں ہوسکا۔ایک انسان ہندوستان کے دور دراز علاقے میں بیٹھ کر امریکہ کے اخبارات، وسائل کا مطالعہ کرسکتا ہے، دنیا کے مختلف ممالک کی لائبریری سے کتابیں پڑھ سکتا ہے، آن لائن کورس کرسکتا ہے وغیرہ۔یہ دلیل ہے کہ بیسویں صدی میں علوم نے ایک دھماکہ کی شکل اختیار کرلی ہے۔

مذکورہ بالا وجوہات کو مدنظر رکھتے ہوئے عصرِ حاضر میں ضروری ہے کہ اساتذہ کو بھی آئی۔سی۔ٹی کے استعمال سے واقف کرایا جائے تاکہ وہ اس کا استعمال کرکے طلبہ کی تعلیم میں نمایاں کردار ادا کرسکیں۔

آئی۔سی۔ٹی کا تعارف:

انفارمیشن اینڈ کمیونکیشن ٹکنالوجی سے مراد وہ آلات ہیں جن کا استعمال معلومات کو جمع کرنے، ان کو محفوظ رکھنے، ان کو بروئے کار لانے، ان کا تجزیہ کرنے اور معلومات فراہم کرنے کے لئے کیا جاتا ہے۔

عصر حاضر میں ICT کی تیز رفتار ترقی نے معلومات کی تنظیم کاری کو بہت آسان اور سستا بنادیا ہے۔جس کی وجہ سے علم کی راہیں بہت آسان ہوگئی ہیں۔

اساتذہ کی تدریس اور ICT کا کردار

نیشنل نالج کمیشن (NKC) کے مطابق "اساتذہ تعلیمی نظام میں سب سے اہمیت کے حامل عنصر ہیں۔ملک میں فی الوقت اعلی تعلیم یافتہ ومتحرک وفعال اساتذہ کی بہت کمی ہے"

اساتذہ کی تدریس وتربیت خواہ ماقبل ملازمت ہو یا برسرِ ملازمت ایک اہم اور مستقل مسئلہ بنا ہوا ہے کیونکہ زیادہ تر ریاستوں میں اس کا نظم وانتظام بہتر انداز میں نہیں ہورہا ہے۔ماقبل ملازمت جو تربیت اساتذہ کو فراہم کی جاتی ہے اس میں مزید توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت ہے۔

NCFTE-2009 نے اسکولنگ میں ICT کے استعمال پر خصوصی زور دیا ہے۔اس فریم ورک میں جو سب سے اہم نکتہ ہے وہ learning کا ہے۔ اور موجودہ دور میں اگر دیکھا جائے تو ICT درس وتدریس کے عمل کا ایک جزو لاینفک بن گیا ہے۔

نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کے بیشتر ممالک میں تعلیم وتربیت کے فروغ کے لئے ICT کا استعمال کثرت سے کیا جارہا ہے۔

اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اگر ICT کا استعمال مؤثر انداز میں کیا جائے تو طلبا میں محرکہ پیدا ہوتا ہے اور طلبا میں دلچسپی پیدا ہوتی ہے کیونکہ ICT کے استعمال میں طلبا کے مختلف حسی اعضاء کا استعمال ہوتا ہے جیسے دیکھنا، سننا وغیرہ۔

ایسے حالات میں جب کہ دنیا میں ہر طرف ٹکنالوجی کا بول بالا ہے اور اس کا استعمال ہر شعبہ میں کیا جارہا ہے اور درس وتدریس میں بھی یہ معاون اور محرک ہے تو ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ اساتذہ جو طلبا کو تعلیم فراہم کرتے ہیں یا جو مستقبل میں تعلیم فراہم کریں گے ان کو بھی ICT کے استعمال سے واقف کرایا جائے تاکہ

www.urduacademyts.com

وہ زمانہ سے کندھا ملا کر سماج کے لئے ایسے افراد تیار کر سکیں جو سماج کی ہر ضرورت کی تکمیل کر سکیں اور ملک وقوم کی ترقی میں اہم کردار ادا کر سکیں۔

اساتذہ کا پیشہ ورانہ فروغ اور ICT:

ICT کو ابھی حالیہ ٹیچر ایجوکیشن کے نصاب کا حصہ بنایا گیا ہے۔ یونیسکو کے مطابق ICT ایک سائنسی، تکنیکی اور نظم وانتظام کی تکنیک ہے جس کا استعمال معلوماتی عمل میں کیا جاتا ہے۔ 1998 میں یونیسکو نے اپنی عالمی تعلیمی رپورٹ "تغیر پذیر دنیا میں اساتذہ اور درس وتدریس" میں دورِ حاضر کی درس وتدریس کے عمل میں ICT کے اطلاق پر زور دیا ہے۔ اور آج ICT اساتذہ کی تدریس کے درسیات کا ایک جز ولاینفک بن گیا ہے۔ ICT پر مبنی ٹکنالوجی جیسے کمپیوٹر، لیپ ٹاپ، ڈیجیٹل کیمرا، ویڈیو، انٹرنیٹ، وبسائٹس، CD, DVD اور دیگر سافٹ ویئر جیسے ورڈ پروسیسنگ، اسپریڈ شیٹ، ای میل، ڈیجیٹل لائبریری، ویڈیو کانفرنس، پروجیکٹر وغیرہ کا استعمال کر کے ہم ترسیل واطلاعات میں درپیش رکاوٹوں کو دور کر سکتے ہیں۔ ICT کا استعمال زیر تربیت اساتذہ کے لئے ایک تربیتی ٹول کے طور پر کیا جاسکتا ہے۔ اس کے لئے جغرافیائی حدود کی کوئی قید نہیں ہے۔ اسی لئے اساتذہ اور اساتذہ کے تدریسی اداروں کے لئے ایک چیلنج ہے کہ وہ ایسے اساتذہ تیار کریں جو مختلف تکنیکی آلات کو تعلیمی، انتظامی، تحقیق ودیگر امور میں استعمال کر سکیں۔ ICT اساتذہ کے پیشہ ورانہ فروغ میں معاون ومددگار ہے۔

اساتذہ کی تدریس میں ICT کے کردارہ کو درج ذیل نکات سے سمجھا جاسکتا ہے:

☆ ICT کے آلات استعمال کرنے سے تدریس پر مفید اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ طلبا کو جو اسباق پڑھائے جاتے ہیں ICT کے آلات کے ذریعہ ان کو آسان بنایا جاتا ہے۔ طلبہ سننے کے ساتھ ساتھ دیکھتے بھی ہیں اس سے سبق کی تفہیم زیادہ ہوتی ہے۔ جو بھی مشکل تصورات ہوتے ہیں ان کو آسانی کے ساتھ طلبہ کے سامنے پیش کرنے میں ICT تعاون کرتا ہے۔

☆ تعلیم میں ICT کے مؤثر استعمال سے اساتذہ طلبا کی تربیت اور پیشہ ورانہ فروغ کی ضرورت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اساتذہ کی ان بڑھتی ضروریات کی تکمیل میں ICT کے آلات اہم کردار ادا کر سکتے ہیں، کیونکہ یہی آلات بہترین تعلیمی مواد تک رسائی، اچھے نظم وانتظام کی سہولیات فراہم کرتی ہے، نیز مؤثر تدریسی مشق کے لئے نمونے فراہم کرتے ہیں۔ اور ریگولر وفاصلاتی دونوں نظامِ تعلیم طلبا کے سپورٹ کے لیے ایک نیٹ ورک کی سہولیات فراہم کرتے ہیں۔

☆ پیشہ ورانہ فروغ کی سرگرمیاں، عملی مشق اور رویوں کے لیے ایک نمونہ کے طور پر ہونا چاہئے اور اس سے اساتذہ کے درمیان اشترا کی جذبہ کا فروغ ہونا چاہئے۔ اسکولی سطح پر جاری پیشہ ورانہ فروغ میں دستیاب ICT کی سہولیات کے استعمال کو کامیابی کی ضمانت کے طور پر دیکھا جاتا ہے بشرطیکہ اس میں اساتذہ کے روز مرہ کی ضروریات اور مشق کے موافق مہارتوں اور وسائل پر زور دیا جائے۔

☆ ICT نے طلبا واساتذہ کے درمیانی خلاء، وقت اور مقام کی رکاوٹوں کو دور کر دیا ہے کیونکہ ایک طالب علم جب چاہے جہاں سے چاہے اپنے استاد سے ان آلات کا استعمال کر کے معلومات حاصل کر سکتا ہے۔ بالفاظِ دیگر ICT نے دوریاں مٹادی ہیں۔

☆ ICT نے اساتذہ، اسکول، ادارے اور یونیورسٹیوں کو ایک ساتھ مربوط کر دیا ہے اور انہیں اس قابل بنادیا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے ICT کا استعمال کر کے ترسیل کر سکیں ساتھ ہی اساتذہ کو اعلی سطح کے وسائل کے ذریعہ مہارت حاصل کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔

☆ ICT کا استعمال کر کے تدریسی عمل کو تقویت فراہم کی جاسکتی ہے ساتھ ہی طلبا واساتذہ کے طریقۂ ترسیل میں تبدیلی لائی جا سکتی ہے۔

☆ ICT کے استعمال کی وجہ سے اساتذہ کی تدریس پر ہونے والی لاگت بھی کم ہوتی ہے کیونکہ اس کے وجہ سے ہم دنیا کے کسی بھی ملک میں رہنے والے ماہرین تعلیم سے بآسانی فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اہم وسائل تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں جو کہ ICT کے بغیر ایک خواب جیسا ہے۔

☆ ماقبل ملازمت وبرسرِ ملازمت دونوں طرح کے اساتذہ کی تدریس وتربیت میں یہ مدد کرتا ہے۔

☆ تدریس کی تیاری وتاثرات کی فراہمی میں معاون ہے۔

☆ ICT کے ذریعہ اساتذہ، NCERT, NAAC, UGC اور NCTE جیسے اہم اداروں سے رابطہ کر سکتا ہے۔

☆ تدریسی مہارتوں اور اختراعی تدریس کو فروغ دینے میں اساتذہ کی مدد کرتا ہے۔

www.urduacademyts.com

☆ ماقبل ملازمت اساتذہ کی تدریس میں ICT کو متعارف کرانے کے لئے مختلف طریقے اور مختلف حکمتِ عملیوں کو بروئے کار لایا جاتا ہے۔ ساتھ ہی مختلف آلات جیسے ورڈ پروسیسنگ، ڈاٹا بیس، اسپریڈ شیٹ وغیرہ کا استعمال کیا جاتا ہے۔

☆ ICT اساتذہ کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ حقیقی کمرۂ جماعت میں اپنی مہارتوں کا استعمال کرسکیں۔

☆ ICT اساتذہ کے تعین قدر میں بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔

☆ ICT کا استعمال کر کے ایک معلم بہت کم وقت میں معلومات کو اپنے طلبا تک پہونچا سکتا ہے۔

☆ تعلیمی اداروں میں بہت سے طلبا تخلیقی صلاحیت کے حامل ہوتے ہیں ICT ان کی شناخت میں بھی مدد کرتا ہے۔

☆ اساتذہ کے تعلیمی ادارے ICT کا ستعمال کر کے درسیات کو فروغ دے سکتے ہیں۔

☆ ICT کی مدد سے تعلیمی ادارے ایک ترسیلی نیٹ ورک تیار کر سکتے ہیں۔

☆ اساتذہ اپنے نیٹ ورک سے ICT کی مدد سے زیادہ سیکھتے ہیں۔

اساتذہ کی تدریس وتربیت میں ICT کے اطلاق کی حکمت عملیاں:

- مناسب انفراسٹرکچر اور تکنیکی سہولیات فراہم کرنا۔
- تمام مضامین میں ICT کا اطلاق کرنا۔
- ماقبل ملازمت اساتذہ کے درسیات میں اس کو جگہ دینا۔

خلاصہ:

سماج میں اساتذہ کو بہت عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور انہیں خاص مقام ومرتبہ حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ سماج میں وہی علوم کا سرچشمہ ہوتا ہے اور وہی سماج کو آگے لے جاتا ہے۔ ICT کی مدد سے اساتذہ اپنی معلومات ومہارتوں کی تجدید کرتے ہیں تاکہ وہ نئے آلات اور وسائل کا استعمال کرسکیں۔ ICT کا استعمال کر کے اساتذہ طلبہ مستقبل میں مؤثر اساتذہ بنیں گے۔ ICT سماج میں تبدیلی لانے کا ایک اہم عامل ہے۔ یہ تعلیم کی نوعیت، اور درس وتدریس کے عمل میں طلبا و اساتذہ کے کردار میں تبدیلی کی صلاحیت رکھتا ہے۔

ہندوستان میں کچھ عرصہ قبل سے اساتذہ نے ٹکنالوجی کا استعمال کمرۂ جماعت میں شروع کیا ہے۔ لیپ ٹاپ، LCD، پروجیکٹر، ڈیسک ٹاپ، اسمارٹ کلاس، میموری اسٹک وغیرہ کا استعمال اساتذہ کے تدریسی اداروں میں اب عام ہونے لگا ہے۔

دورِ حاضر میں خاص طور سے اس Covid-19 Pandemic میں یہ ضرورت مزید شدت سے محسوس کی جارہی ہے کہ نہ صرف چند اساتذہ بلکہ تمام اساتذہ ICT کے استعمال سے واقف ہوں اور اپنی تدریس میں وہ اس کا استعمال کریں تبھی ہم طلبا کے روشن مستقبل کی ضمانت دے سکیں گے۔

☆☆☆

ڈاکٹر صحیفہ سلطانہ
138/B، ودھت وہار، نزد بالا صاحب گرودوارا،
سرائے کالے خان۔ رنگ روڈ۔ نئی دہلی۔ 110014
موبائل: 9430661092

www.urduacademyts.com

سرزمین دولت آباد کی اولین دکنی مثنویاں

بہمنی سلاطین کے اولین بادشاہ کا تعلق ایران کی سرزمین سے تھا اور وہ شیعہ مسلک کا ماننے والا تھا جو محمد تغلق کے ساتھ وہ دہلی سے دولت آباد میں سکونت پذیر ہوا تھا۔ علاؤ الدین حسن گنگو بہمنی کو دہلی کی سرزمین میں علمائے دین، شعراء کرام اور تعلیم و تدریس کے ماہرین سے استفادہ کا موقع ملا۔ 1327ء میں جب وہ محمد تغلق کے ساتھ دولت آباد میں قیام پذیر ہوا، تو اس سے قبل جب تک کہ اس نے دہلی کی سرزمین میں فارسی شاعری کے ذوق کو محسوس کرلیا تھا اس وقت تک دہلی کی سرزمین میں کئی فارسی مثنویوں کی کثرت تھی۔ حضرت نظام الدین محبوب الٰہی دہلویؒ کے مرید و خلیفہ حضرت امیر خسروؒ کی مثنوی ''نہ سپر'' کی شہرت تھی۔ اسی طرح مثنوی ''دیول رانی'' کے توسط سے عشقیہ مثنوی کا چلن عام ہوا تھا۔ اس کے علاوہ دہلی میں فارسی زبان میں داستانوی اور اساطیری مثنویوں کی کثرت تھی۔ اس ماحول سے استفادہ کر کے علاؤ الدین حسن گنگو بہمنی نے ہی نہیں، بلکہ محمد بن تغلق کے ساتھ دہلی سے دکن کی طرف ہجرت کرنے والے بے شمار صوفیہ کرام اور بزرگان دین کو متصوفانہ مثنوی، اخلاقی مثنوی، داستانوی مثنوی اور اساطیری مثنوی کے علاوہ مثنوی کے مختلف انداز یعنی طویل اور مختصر مثنوی کے طریقوں سے بھی واقفیت حاصل کی تھی جو طویل مثنویاں، طویل قصوں پر مبنی ہوتی تھیں اور مختصر مثنویاں پچاس، ساٹھ اشعار پر اختتام پذیر ہوا کرتی تھیں۔ بہمنی دور میں مثنوی کی روایت کو اختیار کر کے اخلاقی انداز میں حالات، واقعات اور قصے کو بیان کرنے کی خصوصیات کی نشاندہی سب سے پہلے صوفیہ کرام اور بزرگانِ دین کے شعری رویے سے فروغ پاتی ہے۔

(دکنی ادب کی تخلیقی خصوصیات، از پروفیسر مجید بیدار، تخلیق کار پبلشرز دہلی، 2021ء، صفحہ 151)

لازمی ہے کہ دکن کی اولین سرزمین کی حیثیت سے دیوگڑھ کو امتیاز حاصل ہے جس کو بزرگانِ دین کی سرزمین کا موقف حاصل ہوا، تو دیوگڑھ کا علاقہ دولت آباد کے نام سے موسوم ہوگیا۔ جس میں سب سے پہلے علاؤ الدین خلجی کے حملوں اور مبارک شاہ خلجی کی تخت نشینی کے بعد جس عظیم بادشاہ نے دولت آباد کی سرزمین کو شعر و ادب اور علوم و فنون سے آراستہ کیا۔ وہ محمد بن تغلق تھا، جو مختلف علوم و فنون میں ماہر ہونے کے علاوہ باضابطہ یکجہتی اور اتحاد کا علمبردار رہا۔ مسلم بادشاہ ہونے کے باوجود مقامی باشندوں کے جذبات اور احساسات کا لحاظ کرنا اس کے مزاج کا حصہ رہا۔ جس کے بارے میں تفصیلی حقائق بیان کئے جاچکے ہیں۔ اگرچہ دولت آباد کی آبادی میں بزرگانِ دین اور علمائے کرام کی آمد کا سلسلہ

www.urduacademyts.com

تین مختلف ادوار پر محیط رہا، ایسے بزرگانِ دین جنہوں نے دولت آباد پائے تخت قرار پانے سے قبل یعنی 1327ء میں دولت آباد کا رخ کیا۔ ان بزرگوں میں حضرت مومن عارف باللہؒ، حضرت جلال الدین گنج رواںؒ اور حضرت منتجب الدین زرزری زربخشؒ کے علاوہ بعد کے دور میں حضرت سید یوسف شاہ راجو قتالؒ اور حضرت بابو جلالؒ کا شمار ہوتا ہے۔ دولت آباد میں پائے تخت کی تبدیلی کے بعد سفر کر کے سکونت اختیار کرنے والے بزرگانِ دین میں حضرت نظام الدین چہاردہ صد اولیاءؒ، حضرت برہان الدین غریبؒ، حضرت شیخ داؤد شیرازیؒ، حضرت زین الدین داؤد شیرازیؒ اور دیگر افراد شامل ہیں جنہوں نے دولت آباد پائے تخت قرار پانے کے بعد اس علاقہ کا رخ کیا۔ 1347ء محمد تغلق کے انتقال کے بعد میں بہمنی سلطنت کا قیام عمل میں آیا۔ پہلے دولت آباد کو پائے تخت بنانے کے بعد وقفہ وقفہ سے گلبرگہ اور بیدر کو پائے تخت کا درجہ حاصل ہوا، اس وقت صوفیا کرام، بزرگانِ دین اور علماء اور فضلاء کے قافلہ دہلی اور اس کے نواحی علاقوں سے دکن کی جانب مراجعت کرنے لگے اور پھر دولت آباد ہی نہیں بلکہ گلبرگہ اور بیدر تک ان بزرگوں کی آمد کا سلسلہ جاری رہا۔ چنانچہ حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کے والد حضرت سید یوسف شاہ راجو قتالؒ نے پائے تخت کی تبدیلی سے قبل دولت آباد کا رخ کیا تھا جو اپنے عہد کے اعتبار سے دکن کے علاقہ میں روضہ کلاں کے باشندے رہے۔ 1326ء سے 1331ء تک ان کا قیام روضہ کلاں میں رہا۔ حضرت بندہ نوازؒ ان کے ہمراہ تھے اور حضرت بندہ نوازؒ کے ماموں سید ابراہیم کو دولت آباد کی سرکار میں اعلیٰ عہدہ حاصل تھا۔ اس طرح اردو کی اولین دکنی مثنوی کا روایتی سلسلہ بہمنی دور سے قبل یعنی تغلق دور کی یادگار کا درجہ رکھتا ہے۔

سور سہاگن سن ری سن
یک یک بول تو چت دھر سن
جو کچ کھاتی تو کھانا
ویساچ اوروں کو دینا
توڑا ٹوٹکا کر نکو
غیر خدا کوں پوج نکو
سید راجو عابد ہے
بخشن ہارا معبود ہے

(دکنی ادب کی تخلیقی خصوصیات، از پروفیسر مجید بیدار، تخلیق کار پبلشرز دہلی، 2021ء، صفحہ 151 تا 152)

ان اشعار کے ذریعہ جن اخلاقی رویوں کو اختیار کرنے اور اپنی اہلیہ کو روحانی نظریہ اختیار کرنے کی ترغیب دیتے ہوئے اس مثنوی میں حضرت شاہ راجو قتالؒ نے نہ صرف اپنی اہلیہ کی ہمت باندھی بلکہ انہیں نیکی اور نیک کاری کا راستہ اختیار کرواتے ہوئے اسلامی شعار کو اختیار کرنے کا جذبہ کو پروان چڑھانے کا ثبوت دیا

www.urduacademyts.com

ہے۔ اس دور میں سہاگن کے ساتھ مقامی اور اکثریتی طبقہ کے رسومات کی نفی بھی ان اشعار میں دکھائی دیتی ہے اور یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ شاعر نے مثنوی کے توسط سے شعری موشگافیوں سے کام لینے کے بجائے مذہبی اور عقائد کی نمائندگی پر توجہ دی ہے۔ اس دور میں خدا کی پرستش کے بجائے مقامی باشندے توڑا اور توٹکا کیا کرتے تھے، جنہیں اسلامی تعلیمات میں کوئی مقام حاصل نہیں۔ اپنی اہلیہ کو مذہب سے وابستہ رہتے ہوئے مقامی طریقوں سے اجتناب کرنے کا جذبہ فراہم کرنا بلاشبہ اس مثنوی کا بنیادی وصف ہے۔ اس طرح مثنوی کے ذریعہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت یوسف شاہ راجو قتالؒ نے اپنی اہلیہ کی ہمت افزائی اور ان کو مذہب سے وابستہ رکھنے کی خاطر اس مثنوی میں اسلامی عقائد اور شرح شریف کے طریقوں کو اختیار کرنے کا سبق سکھایا ہے۔

دولت آباد کی سرزمین میں روضہ کلاں یا پھر روضہ بزرگ کی حیثیت سے مشہور علاقہ آج کے دور میں خلدآباد اور قاضی محمود بحری کے مقبرے اور گورنمنٹ گیسٹ ہاوس کی حیثیت سے شہرت رکھتا ہے۔ اس کے عقب میں حضرت منتجب الدین زرزری زربخشؒ کی درگاہ شریف کا احاطہ ہے، جس کے پیچھے ملک عنبر اور فتح محمد کے علاوہ ملک عنبر کی اہلیہ کا خوبصورت مقبرہ اور داہنی جانب حضرت سید یوسف شاہ راجو قتالؒ کا گنبد بھی موجود ہے، جس کو ان کی رحلت 1331ء کے بعد تعمیر کیا گیا۔ اس طرح محمد تغلق کی جانب سے دولت آباد کو پائے تخت کا درجہ دینے کے چار سال بعد حضرت سید یوسف شاہ راجو قتال کا انتقال ہوا۔ حضرت کی وفات کے بعد ان کی اہلیہ مبارکہ نے حضرت بندہ نوازؒ کی عمر 18 سال ہونے کے بعد اپنے بھائی سید ابراہیم سے اختلاف کی وجہ سے روضہ کلاں کو چھوڑ کر دہلی کا رخ کیا۔ اس وقت حضرت نظام الدین محبوب الٰہی دہلویؒ کا وصال ہو چکا تھا اور ان کے جانشین کی حیثیت سے حضرت نصیر الدین شاہ چراغ دہلویؒ نے صوفیہ کرام کے مسند کو افتخار بخشا۔

پیلن سمرن تج سمرت
سر جی دھرتی کر پربت
سورگ پتالی سرجی تین
سیوا کارن مانس جن
اول ابا بکر، دوم عمر
تیجا عثمان اور حیدر

(دکنی ادب کی تخلیقی خصوصیات، از پروفیسر مجید بیدار، تخلیق کار پبلشرز دہلی، 2021ء، صفحہ 153 تا 154)

موجودہ خلدآباد کے روضہ کلاں کے باشندے حضرت سید یوسف شاہ راجو قتال حسینیؒ نے اپنی اہلیہ کی تربیت کے لئے ''سہاگن نامہ'' تحریر کیا جس کا دورِ تصنیف 1326ء تا 1331ء دور قرار پایا جاتا ہے۔ اس کے بعد روضہ کلاں کے بجائے روضہ خورد کو

www.urduacademyts.com

آباد ہونے کا موقع مل گیا، کیونکہ اس علاقہ میں سب سے پہلے حضرت نظام الدین محبوب الٰہیؒ کے حکم پر حضرت منتجب الدین زرزری زربخشؒ کے حقیقی بھائی حضرت برہان الدین غریبؒ کا ورود ہوا۔ اس طرح روضہ خورد کی رونق میں اضافہ ہوا۔ حضرت غریب بھی دولت آباد کو پائے تخت کا درجہ حاصل ہونے سے قبل اس علاقہ میں داخل ہو چکے تھے اور ان سے قبل حضرت نصیرالدین پون پیک کو روضہ خورد میں امامت اور آخری آرامگاہ کی حیثیت سے مدفون ہونے کا موقع مل گیا تھا۔ 1327ء میں پائے تخت کی تبدیلی کے بعد روضہ خورد کی طرف پیش قدمی کرنے والے بزرگانِ دین میں حضرت زین الدین داؤد شیرازیؒ کا مقام کافی بلند ہے۔ وہ نہ صرف شیراز سے مکہ جا کر اسلامی تعلیمات حاصل کر چکے تھے، بلکہ دہلی پہنچنے کے بعد پہلی مرتبہ خود کو اہلحدیث کا مقلد قرار موقف دیتے ہوئے روضہ کلاں میں داخل ہوئے تھے۔ وہ فارسی کے شاعر اور حضرت برہان الدین غریب کے ملفوظات مرتب کرنے کے خالق بھی قرار دئے جاتے ہیں۔ انہوں نے ابتداء میں حضرت برہان الدین غریبؒ سے ارادت حاصل کرنے کے بجائے راست خدا کی بارگاہ میں عندیہ پیش کرنے کا جواز پیدا کیا۔ لیکن اپنے مسلک سے ہٹ کر جب پیری مریدی کے قائل ہوئے تو پھر انہیں نہ صرف 22 خواجہ کا خطاب حاصل ہوا بلکہ ان کے آستانے کے قریب ہی حضور اکرمؐ کے جبہ مبارک کی زیارت کا سلسلہ شروع کیا گیا جو آج بھی جاری ہے۔ غرض ''نرلک نامہ'' مثنوی کے ذریعہ حضرت زین الدین داؤد شیرازیؒ نے جن لفظیات کو فارسی رسم الخط میں پیش کیا ہے، اس کی طرف اشارہ بھی ضروری ہے تاکہ پتہ چل جائے کہ 13 ویں صدی کے وسط میں دکن کے علاقہ میں پروان چڑھنے والی اردو زبان کی ابتدائی شکل یعنی دکنی زبان کا انداز کس طرز کی نمائندگی کرتا ہے۔

فہیم الدین
ریسرچ اسکالر تلنگانہ یونیورسٹی، نظام آباد

☆☆☆

www.urduacademyts.com

ناول ''سلام دین کا ہاؤس بوٹ'' کا سماجی المیہ

ناول ایک ایسی صنف ہے جس میں انسانی معاشرے کی تہذیبی و ثقافتی تصویریں کھینچی جاتی ہیں ۔ اردو ناول کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ انسانی زندگی کا کارواں جس بھی ڈگر سے گزرا، ہر دور کا یہ سفر ناول نگاروں نے اپنی تحریروں سے اجاگر کیا۔ انسانی زندگی میں آنے والے نشیب و فراز کو زیبِ قرطاس کیا ہے ۔ نذیر احمد سے لے کر مرزا ہادی رسوؔا اور موجودہ دور میں بھی یہ صنف معاشرے کی ترجمانی کررہی ہے۔

عہد حاضر سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور ہے یہ حقیقت ہے کہ آج اکیسویں صدی شعر و ادب کے لحاظ سے بھی ترقی سے غافل نہیں ۔ ادب جو زندگی کا آئینہ ہے ۔ ادب جو زندگی کا ترجمان ہوتا ہے ۔ ایک حساس قلم کار سماج میں ادبی تحریروں سے رنگ بھرتا رہتا ہے ۔ معاشرے کے بیچ ہونے والے تمام واقعات کو اپنی تخلیق کے سہارے عیاں کرتا ہے ۔ ناول جو عالمی ادب میں زیادہ پڑھی جانے والی صنف کا درجہ رکھتی ہے' اس کے قارئین کے ساتھ ہر دور کے سیاسی ، سماجی و اقتصادی مسائل سے منسلک رہا ہے ۔

دیپک کنول کے ناولوں میں فکری و فنی ہنر مندی کا خوشگوار امتزاج ہے ۔ انھوں نے کشمیر کے زوال آمادہ معاشرے کے ان گوشوں پر توجہ مبذول کروائی ہے جو ہماری نگاہوں کے زیر پردہ ہیں اور بے رحمی سے معاشرے کی شان و شوکت کو مسمار کر رہے ہیں ۔ ان کی تحریروں میں کشمیر کی معاشرتی زندگی ، بے بس اور مظلوم طبقے کی تصویر کھل کر سامنے آتی ہے ۔ کشمیر کے دلکش مناظر بھی یک لخت قاری کو متوجہ کرتے ہیں

ان کے ناولوں میں غریب طبقہ اور اس کی محرومی ، اداسی ، کرب و اذیت ، رشتے ناتواں کا عارضی پن صاف ظاہر ہوتا ہے ۔ دیپک کنول کے ناولوں میں تقریباً سبھی کردار معاشرے کی زندگی اور مسائل کی ترجمانی کرتے ہیں ۔ ان کے ناول 'ہم تیرے ہو گئے ' 'دردانہ' اور 'سلام دین کا ہاؤس بوٹ' بطور خاص سماجی آئینہ ہیں ۔ موجودہ دور میں مادی ترقی نے انسان کو کن اخلاقی اور روحانی پستیوں سے دوچار کیا اس کی اچھی تصویر ان کے ناول 'سلام دین کا ہاؤس بوٹ' میں ملتی ہے جو ۲۰۱۴ء میں شائع ہوا۔

ناول کا مرکزی کردار سلام دین زندگی کے سفر میں مختلف ذہنی اور جذباتی تجربات سے گزرتا ہے ۔ زندگی کے مختلف پہلوؤں اور پیچیدگیوں کو اُجاگر کرنے کے لیے محی الدین ، سلمہ ، غلاما ، بشیر ، ماریا ، سلطان ککرو ، امین ، فاروق ، راجی ، تنویر کے کردار ناول میں مناسب موقعوں پر نظر آتے ہیں ۔ مصنف نے کشمیر کے خوبصورت مناظر کو ناول کے شروع میں پیش کیا ہے ۔ جھیل ڈل کی بے تابی اور سوگ وار ہاؤس بوٹ جو سرد موسم کے تشدد سے ہارے ہوتے ہیں ۔ اپریل کا یہ مہینہ ان

www.urduacademyts.com

کے لئے عید کے دن کا چاند ہوتا ہے ۔ ناول کا اقتباس ملاحظہ ہو:۔

''صبح جب بادل ہٹے اور سورج کی پہلی کرن نے وادی کے رخساروں کو چوما تو جھیل ڈل کا چہرہ یوں ابھر کے آیا جیسے کسی نئی نویلی دولہن نے اپنے چہرے سے گھونگھٹ ہٹا لیا ہو۔ ہر سو ایک نئی تازگی اور دلکشی نظر آرہی تھی۔

اپریل کا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ بید اور سفیدے کے درختوں کی ہری ہری ٹہنیوں سے ننھی ننھی کونپلیں اپنی نیم وا آنکھوں سے یوں جھانک رہی تھیں جیسے وہ ایک کوکھ سے باہر آگئی ہوں۔ ہوا کے لطیف جھونکے بہار کے نقیب بن کر جونہی وادی میں دستک دینے لگتے ہیں تو ایک تخلیقی عمل شروع ہوتا ہے۔اس تخلیق کا اصل محرک بہار کے وہ خوشگوار جھونکے ہوتے ہیں ۔ جو ہر شے میں نئے بیج بوتے ہیں، اور دیکھتے ہی دیکھتے ہر کوکھ سے نئی کونپلیں جنم لینے لگتی ہیں۔

آج بھی ویسا ہی ہو رہا تھا۔ نیلے آسمان کا کانچ جس پر کئی ہفتوں سے کالے مٹیالے بادل کائی کی طرح جمے ہوئے تھے۔آج سفاف اور چمکیلا دکھائی دے رہا تھا۔ ڈل کے منجمد پانیوں میں موجیں ہلکورے لینے لگی تھیں ۔ آراستہ و پیراستہ سوگ میں ڈوبے ہاؤس بوٹ آج یوں بانہیں پھیلائے نظر آرہے تھے جیسے کوئی سینے سے لگانے کے لئے بے تاب ہوں سالوں سے بند پڑے موٹر لاونچ کے زنگ آلودہ انجن بدمست ہاتھوں کی طرح چیخنے چنگھاڑنے لگے ۔ یہ موٹر لاونچ جونہی پانی پر دوڑنے لگے تو ڈل میں ایسا تلاطم اٹھا جیسے بہت بڑا طوفان آگیا ہو۔لہریں بے قابو ہونے لگیں۔جھیل ڈل کے گرد بنے باندھ پر پانی کے تھپیڑے ایسے پڑنے لگے جیسے کوئی اناڑی سازندہ اپنے سازوں کو جانچ رہا ہو...نہرو پارک کے گھاٹ پر کھڑی کشتیوں کا تو حال، بے حال تھا۔ پانی کی اچھالیں انہیں جھنجوڑ کے بے دم کر چکی تھیں'' (ص،۴،۳)

اس اقتباس میں مصنف نے کشمیر کے حسن کو نکھارا ہے ۔ وہاں کی طرز زندگی کے گوشوں کو ایک لڑی میں پرویا ہے۔محمد سلطان جو سولہ ککرو کے نام سے معروف ہے۔ اور ناول میں منفی کردار کی رہنمائی کرتا ہے۔ کشمیر کا یہ طبقہ جو ہاؤس بوٹ میں رہتا ہے۔ ان کے آپسی رنجش و تعلقات کو مصنف نے چابکدستی سے بیان کیا ہے۔

سلام دین جو کہ مثبت سوچ کا مالک ہے ۔اس کا ایک ہاؤس بوٹ ہے۔سلام دین نہایت ہی شریف النفس شخص ہے' وہ اپنے بے ایمان اور مکار پھوپھا کی سازشوں کا شکار ہوتا رہتا ہے۔سلام دین کے ماں باپ کا انتقال ہو چکا ہے۔ وہ اپنی جفاکشی سے چھوٹے بھائی غلاما اور بہن سلمہ کی کفالت کرتا ہے۔ سلام دین کی رحم دلی کا یہ حال ہے کہ وہ اپنا چولہا بجھا کر دوسروں کا چولہا جلانا چاہتا ہے ۔لیکن معاشرے میں مکار اور چلاک سولہ ککرو جیسے کردار کہاں رنگ بھرنے دیتے ہیں ۔ سماج میں انتشار حامی کی مصنف نے جو تصویر پیش کی ہے۔ یہ دیکھیے:

''اگلے روز غلاما پو پھٹنے سے پہلے ہی ٹورسٹ سینٹر چلا گیا۔سلام دین آرام سے اٹھا۔ منہ ہاتھ دھو کے چائے پی لی اور پھر کچھ سامان لینے ڈل گیٹ چلا گیا۔ڈل گیٹ سے

www.urduacademyts.com

سامان لے کے جب وہ لوٹ رہا تھا تو نہرو پارک کے ٹیکسی اسٹینڈ کے پاس اسے سولہ ککرو گھومتا ہوا دکھائی دیا۔ سولہ ککرو کو دیکھ کر سلام دین کا پارہ چڑھ گیا۔ اور وہ جارحانہ انداز میں سولہ ککرو کی جانب بڑھا۔ سولہ ککرو اس کے تیور دور سے ہی بھانپ چکا تھا اس لئے وہ منہ پھیر کر گھاٹ کی طرف تیزی سے بڑھنے لگا۔ سلام دین بھی اسے کہاں چھوڑنے والا تھا۔ اس نے اسے جا کر لپک ہی لیا۔

''ارے کاکا بات تو سنو''

''دیکھو میں اس وقت جلدی میں ہوں۔'' وہ بدحواسی کے عالم میں بولا۔ ''پھر کبھی بات کرلیں گے۔''

''ایسی بھی کیا جلدی ہے۔'' سلام دین نے بڑی مضبوطی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے روک لیا۔ کاکا تھوڑی دیر مجھ سے بات تو کرلونا۔''

''کیا بات کرنی ہے تجھے۔؟'' اب کے اس نے رکھائی سے پوچھا۔

''کل تو نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا کاکا۔''

''کیا جھوٹ بالا۔'' وہ اس پر غرانے لگا۔ ''ہاں کیا جھوٹ بولا تم سے؟''

''یہی کہ تمہارے گھر میں پچھلے چار دن سے چولہا نہیں جلا۔'' (ص۔۱۰)

ناول کا کردار ماریا ایک انگریز لڑکی ہے جس کو غلاما اپنے ساتھ نہرو پارک سے ٹورسٹ لایا تھا اور اس کے ہاؤس بوٹ کی ٹورسٹ تھی۔ مصنف نے اس کے قد و قامت کو بیان کیا ہے اور ساتھ میں ماں کی ممتا کی محرومی کا شکار یہ خوبصورت جسم کس طرح خود کو موت کے قریب لے جا رہی ہے۔ ناول کا یہ اقتباس زیر نظر ہے:

''ماریا بلا کی خوبصورت تھی ۔ چھریرا بدن ، تیکھا ناک نقشہ، ہرنی جیسی آنکھیں، کوئل جیسی آواز۔ وہ جب بھی بات کرتی تھی، تو ایسا لگتا تھا جیسے اس کے گلے سے سر نکل رہے ہوں، مزے کی بات یہ تھی کہ وہ انگریزن ہو کر بھی ہندی بڑی آسانی سے بول لیا کرتی تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ پچھلے آٹھ سال سے بمبئی میں اپنے باپ رچرڈ والکر کے ساتھ رہتی تھی جو کہ ایک بدیسی کمپنی میں یہاں کام کر رہا تھا۔ اس کی ماں لندن میں رہتی تھی ۔ اس نے دس برس پہلے مسٹر والکر سے علیحدگی اختیار کی تھی۔ بیٹی باپ کے ساتھ ہی رہی پر ماں کی کمی نے اسے ہمیشہ پریشان کیا۔ اس خلا کو پر کرنے کے لئے اس نے ڈرگس کا سہارا لیا۔ اب وہ پوری طرح سے ڈرگس کی عادی ہو چکی ہے۔'' (ص۔۱۵)

واقعی نشہ سماج میں ایک بری وبا ہے جس کی بدولت کئی گھر اجڑتے ہیں اور کئی گھریلو تشدد نمودار ہوتے ہیں۔ اس مرض کا شکار سلام دین بھی ہوتا ہے۔ جو اس وبا سے نا آشنا ہے۔ اچانک ذہنی وباؤ میں آ کر ماریا کی ڈرگس والی سگریٹ پیتا ہے۔ بشیر ندرو اپنے دوست تنویر ڈار کے ساتھ سلام دین کا گھر دیکھنے آیا ہے۔ جس کی بہن کا رشتہ سلام دین کے لئے مہدہ صاحبا لائے تھے۔ ڈرگس والی سگریٹ ایک دم خوشی بھرے ماحول کو ماتم میں بدل دیتی ہے اس کے بعد فیملی میں ایک ماتم

www.urduacademyts.com

چھایا رہتا ہے۔ناول کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''یہ تم نے اچھا نہیں کیا لالہ۔کل جب یہ بات آس پڑوس میں پھیل جائے گی تو لوگ تھوتھو کریں گے ہم پر۔تم نے اپنے ماتھے پر رسوائی کی لیبل تو لگا دی، ساتھ میں اپنی بہن کی تقدیر پر بھی بدنصیبی کی مہر ثبت کی۔''

سلام دین رو کر بولا۔''میرا یقین کرو غلاما۔جو کچھ بھی ہوا۔بخدا انجانے میں ہوا۔''

اب کے سلمہ ابل پڑی۔

''لالہ ہمیں اپنی ان جھوٹی قسموں سے بہکانے کی کوشش مت کرو۔ارے تم کو شادی کرنی نہیں تھی تو یہ سب ڈرامہ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔تم لڑکی والوں سے اپنی من کی بات کہہ دیتے تو قصہ وہیں پہ ختم ہو جاتا۔''

''تم سمجھتی ہو میں جھوٹ بول رہا ہوں۔''وہ قدرے ترشی سے بولا۔''اور وہ جو کچھ بھی ہوا ڈرامہ تھا۔ارے وہ تو کوئی پاگل ہی ہو سکتا ہے جو اپنی رسوائی کو راہ فرار کے طور پر استعمال کرے۔''

''اگر یہ ڈرامہ نہیں تھا تو کیا تھا۔''غلاما نے گرم ہو کے پوچھا۔''(ص۔۴۴)

سلام دین کی اس حرکت سے اس کا بھائی غلاما اور سلمہ بہت ناراض تھے مگر یہ سب اس سے انجانے میں ہوا۔ سولہ ککرو جو ناول میں منفی سوچ کا حامی ہے۔وہ کس طرح سلاما اور غلاما کی زندگی میں خلل پیدا کرتا ہے۔وہ خود کو بازی گر مانتا ہے اور ماریا کو اپنی مکاری کا شکار بناتا ہے۔جس کا ڈر غلاما کو پہلے ہی تھا۔یہ دیکھئے:

''آج ماریا کو مکاری سے اپنے بس میں کر کے اور اسے سلام دین کے خلاف بھڑکا کر، وہ بازی مار گیا تھا۔غلاما اپنے بھائی کے بارے میں سوچنے لگا۔جس کے دل میں پہلی بار محبت کا پھول کھلا تھا۔جس پہلی بار کسی لڑکی کو من کی گہرائیوں سے چاہا تھا پر محبت کی تکمیل سے پہلے ہی سولہ ککرو اس پیار کے بندھن پر کند چھری چلا چکا تھا۔وہ محبت کی پھلواری پر بجلیاں گرا چکا تھا۔

غلاما کا کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ایک طرف سولہ ککرو کی گھناؤنی صورت کو یاد کر کے اس کا خون کھول رہا تھا، دوسری طرف اپنے بھائی کے معصوم چہرے کا خیال آتے ہی اس کا کلیجہ کٹ کٹ کے گر رہا تھا۔''(ص۔۱۱۴)

سولہ ککرو ماریا کو اپنے ہاؤس بوٹ میں لے جاتا ہے۔ماریا کو چرس بھرا سگریٹ پلاتا ہے۔جس سے وہ بے سدھ ہو چکی ہوتی ہے، پھر اپنے بیٹے امین کے ساتھ سگریٹ سلگاتا ہے اور ماریا کو سلام دین کے خلاف کرنے کی منصوبہ بندی تیار کرتا ہے۔اور وہ چالاکیاں اپنے بیٹے کو بتایا ہے۔نشے کی کیفیت میں جو باپ بیٹے کی گفتگو ہوتی ہے، ملاحظہ فرمائیں:

''لو ابا...دم لگا لو۔۔۔!''

''اس میں مصالحہ بھرا ہے کیا؟''

''ہاں تھوڑا سا ہے۔دو کش لگا لو گے تو تمہارے چودہ طبق روشن ہو جائیں گے۔۔۔''

مضامین

www.urduacademyts.com

سولہ ککرو پہ تو پہلے سے ہی نشے کی سی کیفیت طاری تھی۔ اس نے دو چار کش کیا لگائے کہ وہ سچ مچ جھومنے لگا۔ ''مزا آ گیا...'' وہ جھومتے ہوئے بولا۔

''آ گیا نا مزا...'' امین خوش ہو کے بولا۔ ''اب مجھے بتاؤ کہ تم نے اس میم کو ایسی کون سی گولی کھلا دی جو یہ سلام دین سے الگ ہو کے یہاں آ گئی...''

''سیدھی سی بات ہے بیٹا۔'' امین خوش ہو کے بولا۔ ''عورت کو مرد سے جدا کرنا ہے تو اس کے لئے دوسری عورت پیدا کرو۔ عورت جس قوم کی بھی ہو، شک اور جلن کا مادہ اس کے خمیر میں ہوتا ہے۔ میں نے ایک دن بشیر ندرو کی بہن راجی کو ہاؤس بوٹ میں جاتے دیکھا کہ میرے شاطر دماغ نے ایک جال بنا...'' (ص۔۱۳۷)

مذکورہ بالا اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نشہ اور مکاری میں احترام کو گھائل ہونا پڑتا ہے۔ ایک باوقار معاشرے میں والدین اور اولاد کے بیچ اس قسم کی گفتگو زیب نہیں دیتی۔

ناول کے اختتام میں سلام دین کی ایمانداری اور سادگی کی جیت ہوتی ہے۔ سلام دین کے گھر خوشی کا جشن ہوتا ہے اور سولہ ککرو کو ندامت اور گرفتاری ہاتھ آتی ہے۔

ناول نگار نے معاشرتی تبدیلیاں لاتعلقی کے امکانات اور شرارت کو خوبصورتی کے ساتھ واضح کیا ہے۔ زندہ ادب اپنے وقت کے مسائل کا مظہر ہوتا ہے۔ سماجی مسرتیں اور محرومیاں اس میں صاف ظاہر ہوتی ہیں۔ ناول میں سولہ ککرو جیسے فرد کی سازشیں اور ان کا انجام بڑی مہارت سے سمویا ہے۔ ناول میں عصری لہروں کی تپش صاف طور پر محسوس ہوتی ہے۔ کشمیر کی سرزمین سے متعلق یہ ناول انسانی زندگی اور معاشرتی حالات کی پر اثر تصویر ہے۔ ناول نگار اس سرزمین کے ذرے ذرے سے واقف ہے۔

ناول کے مطالعہ کے بعد اس حقیقت پہ پردہ رہے ممکن نہیں۔ مصنف کشمیری تہذیب وتمدن اور وہاں کے مقامی حالات وواقعات سے خوب واقفیت رکھتے ہیں۔ وہ کشمیر کے پیچیدہ مسائل پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ کشمیری عوام کے دکھ درد سے بخوبی واقف ہیں ان کی پسماندگی، سادگی اور معصومیت نے فن کار کو متاثر کیا ہے۔

یہ ناول زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات کی غمازی کرتا ہے اور اس کا قصہ زندگی کی چار دیواری کے اندر جنم لیتا ہے اور آگے بڑھنے کے ساتھ ختم ہوتا ہے۔ اس میں سماجی انتشار، محرومی، بے مہری وخودداری جیسی بیماریاں دیکھنے کو ملتی ہیں ہے۔ قصے کا ربط، پلاٹ کی مضبوطی، زبان کی سادگی و صفائی، بے تکلفی اور مکالموں کی بے ساختگی نے ناول کو دلفریب بنا دیا ہے۔ انہوں نے سماج کے مسائل اور سازشوں کو جس رنگ میں پیش کیا ہے وہ قابل قبول ہے۔ یہی ان کی تخلیقی بصیرت اور فنی شعور کی خوبصورت مثالیں ہیں۔

مختار احمد (ریسرچ اسکالر اردو)
کمرہ نمبر۔356، ستلج ہاسٹل،
جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی، پن کوڈ 110067
موبائل نمبر۔ 919858566851+

www.urduacademyts.com

ناول کی صنف اور فن

عالمی سطح پر جس صنف کو تاریخی حیثیت حاصل ہوئی اور اُسے ہندوستان میں بھی مقبولیت کا جواز پیدا ہوا اس سلسلہ میں ناول اور اس کے فن کے بارے میں معلومات حاصل کرنا ضروری ہے۔ اس خصوص میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری یہ لکھتے ہیں کہ

''اب سارے ہندوستان کی زبانیں تبدیلیوں سے دوچار تھیں۔ اصلاحات ان سب کا مقصد عظیم تھا۔ اس زمانہ میں انگریزی ادب کے ذریعہ ہندوستانی نشاۃ ثانیہ ہوا۔ اس منظر نے تمام ہندوستانی زبانوں کو ایک نئی شاہراہ پر ڈال دیا''۔ (Language and Literature of Modern India، صفحہ:105)

یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ جس طرح عالمی سطح پر مقبول زبان یعنی انگریزی ادب کے شاہکاروں کو اردو میں پیش کرنے کی وجہ سے اردو کی ادبی خصوصیت میں اضافہ ہی نہیں ہوا بلکہ اردو زبان نے یہ ثابت کردیا کہ وہ ایک ایسی ہندوستانی زبان ہے جو یوروپ کی عالمی سطح پر مقبول زبانوں سے استفادہ کرتی ہے اور اپنی زبان کے ادب کو نثر اور شاعری سے مالامال کرکے نئی اصناف کا بھی استقبال کرتی ہے۔ اردو میں باضابطہ ناول نگاری کا رجحان داستانوں کی ترقی کا دور سمجھا جاتا ہے۔ اس خصوص میں ڈپٹی نذیر احمد سے قبل تک داستانیں اور تمثیلی قصوں کا رواج تھا۔ اس کے بجائے اردو میں ناول نگاری کی شروعات کے بارے میں اس حقیقت کا انکشاف کیا جاتا ہے۔

''ڈپٹی نذیر احمد فرماتے ہیں کہ ''جس روز سے آدمی پیدا ہوتا ہے اس وقت سے مرنے تک اس کو جو بھی باتیں پیش آتی ہیں اور جس طرح اس کی حالت بدلا کرتی ہے ان سب کا بیان ہی ناول ہے''۔

انگریزی ادب میں استعمال ہونے والی صنف درحقیقت افسانے کی طویل قسم کی حیثیت سے اہمیت کی حامل ہے۔ اس صنف کو اہل اردو نے انگریزی زبان سے حاصل کیا۔ انگریزی زبان میں اس نثری صنف کو اطالوی زبان سے حاصل کیا، جس کی تفصیلات اس طرح درج ہیں:

''ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے ناول کے آغاز سے متعلق اس طرح اظہار خیال کیا ہے کہ ناول، اطالوی زبان کا لفظ ہے۔ اس کی مُشَکَّل ''Novella'' ہے جو اردو میں انگریزی کے واسطے سے آیا اور اس وقت انگریزی میں ایک صنف ادب کی حیثیت سے ناول کی روایت پختہ ہوچکی تھی لیکن اٹلی والے نظم و نثر میں روزمرہ زندگی کے معمولی واقعات کو مسلسل اور مربوط انداز میں ناویلا کے نام سے یاد کرتے تھے۔ کبھی کبھی ان قصوں کی بنیاد رزمیہ کہانیوں پر رکھی جاتی تھی اور کبھی گھریلو واقعات سے ناویلا کا تانا بانا تیار ہوتا تھا''۔ (اردو نثر کا فنی ارتقاء ڈاکٹر زماں فتح پوری، ناول فنی نقطہ نظر سے۔ صفحہ:76)

ہندوستان میں موجود مختلف فرقے، مذاہب اور ذاتوں کے علاوہ باضابطہ اردو زبان کی مقبولیت کے اسباب یہی

www.urduacademyts.com

رہے کہ اردو داں طبقے میں نئے نظریات اور خیالات کو اختیار کرنے میں کسی قسم کی تاخیر کو ملحوظ نہیں رکھا گیا بلکہ ناول نگاری کی صنف کو اردو میں ترقی دینے کے لئے اہم کارنامے انجام دیئے۔ اس حقیقت کو جاننا ضروری ہے کہ اردو میں ناول نگاری کے آغاز سے قبل ہندوستان کی کس زبان میں ناول نگاری کا وصف قائم تھا۔

''ہندوستان میں 1857 سے پہلے کسی زبان میں بھی کوئی ناول نہیں لکھا گیا۔ ڈاکٹر چٹرجی نے مراٹھی زبان کے ادیب نندشنکر کے ناول ''کرن کھیلو'' 1866ء کو پہلا ناول قرار دیا ہے''۔ (Language and Literature of Modern India، صفحہ:242)

یہ حقیقت اپنی جگہ مُسلّم ہے کہ ہندوستانی زبانوں میں خاص طور پر آریائی شناخت رکھنے والی زبان کی حیثیت سے سب سے پہلے مراٹھی زبان میں ناول کا آغاز ہوا۔ اردو کو بھی آریائی زبان کا درجہ حاصل ہے' اس لئے کھڑی بولی سے نکلی ہوئی اردو زبان کا تعارفی جائزہ صرف ایسی زبان سے کیا جاسکتا ہے جو بلاشبہ آریائی زبان ہونے کا موقف رکھتی ہو۔ اس لئے اردو زبان میں باضابطہ ناول نگاری کے آغاز یعنی 1869ء سے قبل مرہٹی زبان میں لکھا ہوا ناول ''کرن کھیلو'' کو مرہٹی کا پہلا ناول قرار دیا گیا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو سے قبل ہندوستانی زبانوں میں مرہٹی زبان میں ناول لکھنے کا آغاز ہوا۔ اسی طرح یہ ناول بھی اپنی معاشرتی اہمیت کو اُجاگر کرتے ہوئے یہ لکھا گیا ہے۔

ناول خواہ کسی زبان میں لکھا جائے وہ سماجی تاریخ کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ یہ جس عہد اور جس مقام کی بنیادوں پر لکھا جاتا ہے اس میں اس مقام کے افراد' وہاں کا جغرافیائی پس منظر' تاریخی آثار، وہاں کے رسم ورواج، تہذیب وتمدن، معاشرتی' سماجی طور طریقے، زبان و بیان کا انداز، بولی ٹھولی اور محاورہ، گلیاں اور چوبارے، دشت وصحرا، باغ و بن، ندی نالے غرض اس مقام کی ہر طرح سے عکاسی کرتا ہے۔

1857ء کے بعد نئے حالات کو جب پورا استحکام ہوا تو ناول نگاری کا آغاز ہوا۔ نذیر احمد نے اردو ناول نگاری کی بنیاد رکھی۔ اسی طرح اردو میں نذیر احمد کی مرأۃ العروس 1869ء توبۃ النصوح 1877ء، بنات النعش 1873ء، ابن الوقت 1888ء اور رہائی، رویائے صادقہ جیسے ناول اردو ناول نگاری کا نقطہ آغاز کہے جاسکتے ہیں۔ نذیر احمد نے ان تمام ناولوں کو طبقہ نسواں کی اصلاح کے لئے لکھا۔

نذیر احمد ایک عورت کے لئے شرافت، نیکی، پارسائی، تمیز وتہذیب، اخلاق اور امور خانہ داری اور خدمت گزاری جیسے اوصاف کو ناگزیر سمجھتے ہیں۔ ترنم ریاض لکھتی ہیں:

''نذیر احمد نے مرأۃ العروس میں اصغری کے کردار کے ذریعہ ایک رول ماڈل تیار کرلیا اور یہ رول ماڈل اردو ادب میں خاصی دیر تک ڈولتا رہا۔ اصغری کا کردار جو دینی علوم کے علاوہ دنیاوی علوم کی تاریخ، سائنس، جغرافیہ اور جنرل نالج سے مالا مال تھا' مسلمان اردو طبقے میں ایک ماڈل کی حیثیت سے تقریباً آدھی صدی تک مقبول رہا۔'' (خواتین اردو ادب میں تانیثی رجحان' مشمولہ شاعر' شمارہ 11، 2003، صفحہ:34)

www.urduacademyts.com

غرض اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اردو میں باضابطہ مثالی کرداروں کے ذریعہ نذیر احمد نے اپنا ناول ''مرأۃ العروس'' لکھا جس میں دو اہم نصابی کردار اصغری اور اکبری ہیں۔ کسی بھی فن پارے میں مثالی کرداروں کو پیش کرنا اور کسی کردار میں خوبیاں اور کسی دوسرے کردار میں خرابیوں کو اُجاگر کیا جائے تو ایسے قصوں کو تمثیل کا درجہ دیا جاتا ہے۔ جو اردو نثر میں حکایت اور داستان کے ذریعہ لکھی جانے والی تحریریں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کی پہلی داستان 1635ء میں لکھی ہوئی ملا وجہی کی ''سب رس'' کو بھی تمثیلی قصے کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے۔ اس پس منظر میں نذیر احمد کے ناول بھی تمثیلی قصے کی نمائندگی کرتے ہیں۔ لیکن نذیر احمد نے ان کرداروں کے درمیان جس سماج اور معاشرے کی نمائندگی کی ہے وہ بلاشبہ دہلی کا مسلم معاشرہ ہے۔ جبکہ تمثیل میں کسی بھی معاشرے کی نمائندگی کے بغیر کرداروں کو مثالی طور پر واضح کیا جاتا ہے۔ یہ انداز ڈپٹی نذیر احمد کے قصے ''مرأۃ العروس'' میں موجود نمونے اور ماحول کی پیش کشی میں دہلی کے اشرافیہ کو بطور نمونہ پیش کیا گیا ہے۔ اس لئے ڈپٹی نذیر احمد کے قصوں کو تمثیلی قصہ کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ کیوں کہ ان کے ہر ناول میں دہلی کے معاشرے اور دہلی میں موجود انگریز طبقے کی سرگرمیوں کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ اس لئے نذیر احمد کے قصے تمثیل کی حدوں سے نکل کر ناول کی حدوں میں داخل ہوجاتے ہیں۔ جس کے بارے میں علی احمد فاطمی لکھتے ہیں:

''نذیر احمد نے پہلی بار ناول کی صنف کو روشناس کروایا اور پہلی بار مسلمانوں کے متوسط گھرانوں کی روز مرہ کی زندگی، تربیتی مسائل، اور بالخصوص لڑکیوں کے تہذیبی و تعلیمی مسائل پر روشنی ڈالی۔ کسی ناول میں بیوہ کا مسئلہ اور کسی میں شادی کا مسئلہ، کسی میں ہنرمندی کے مسئلے کو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے اور حد یہ ہے کہ ہریالی کے کردار میں نذیر نے طوائف کو بڑے سلیقے سے پیش کیا ہے''۔ (علی احمد فاطمی، تحریک نسواں اور اردو ادب۔ صفحہ:47)

نذیر احمد کے قصوں کو داستانوں اور حکایات کا درجہ نہیں دیا جاسکتا، حکایت میں مثالی کرداروں کے علاوہ جانور اور چرند پرند بھی کردار کی حیثیت سے پیش ہوسکتے ہیں لیکن حکایت کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مختصر قصہ بیان ہوتا ہے۔ جبکہ ناول میں طوالت کی خصوصیت شامل ہوتی ہے۔ اس کے بجائے داستانوں میں مافوق الفطرت عناصر اور جادو کے علاوہ جادوئی اثرات کو پیش کیا جاتا ہے جو طویل قصے پر مبنی ہوتے ہیں۔ اس کے بجائے تمثیل میں مثالی قصے ضرور پیش ہوتے ہیں، لیکن اس کا ماحول کسی زمانے یا معاشرہ سے متعلق نہیں ہوتا بلکہ قصے کو حکایت کے انداز سے طوالت دی جائے اور داستان کے انداز سے کم انداز اختیار کر کے کرداروں کو مثالی رکھا جائے لیکن ماحول کسی بھی ملک یا پھر شہر کے علاوہ گاؤں سے متعلق وابستگی اختیار کرے تو ایسے قصوں کو نہ تو تمثیل کہا جاسکتا ہے، اور نہ انہیں داستان اور حکایت کے زمرہ میں شمار کیا جاتا ہے بلکہ ایسے قصے ماحول اور کرداروں کی نمائندگی کا اشاریہ بنتے ہیں تو اس قسم کے قصے کو ناول کی حیثیت سے شہرت حاصل ہوتی ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے قصوں میں دہلی کا ماحول پیش کیا ہے اور کرداروں کو گرچہ مثالی

مضامین

www.urduacademyts.com

حیثیت دی ہے لیکن اس سے زیادہ اہم حقیقت یہ ہے کہ کرداروں کا ماحول زندگی سے قربت کا ماحول شامل کیا ہے اس لئے نذیر احمد کے قصوں کو نہ تو داستانوں میں شمار کیا جاسکتا ہے' کیوں کہ وہ حد درجہ طویل نہیں جیسی داستانیں ہوتی ہیں۔ اور ان میں مافوق الفطرت عناصر اور جادوئی کرشمات کا ذکر نہیں' اور وہ حد درجہ مختصر بھی نہیں جس کی بنیاد پر ان کا شمار حکایت میں کیا جائے۔ لازمی ہے کہ کرداروں کے مثالی ہونے پر نذیر احمد کے ناول کو اس لئے تمثیل نہیں کہا جاسکتا کہ انہوں نے کرداروں کو ضرور ناموں کی مناسبت سے تمثیلی پیرائے سے وابستہ کیا ہے' لیکن قصے اور اس کی تفصیلات کا تعلق ماحول سے قائم ہوجاتا ہے اس لئے نذیر احمد کے قصوں کو داستانوں میں بھی شمار نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی ان کے توسط سے تمثیل نگاری کی روایت مستحکم ہوتی ہے' بلکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ انسانوں کی فلاح و بہبود کے لئے ان کے لکھے ہوئے قصے ضرور نصیحت آمیز ہیں' لیکن حکایت کے ذریعہ جس نصیحت آمیز انداز کو نمائندگی دے کر واقعہ کے اختصار کو پیش نظر رکھا جاتا ہے' وہ انداز ڈپٹی نذیر احمد کے قصوں میں نہیں۔ جس سے واضح ثبوت ملتا ہے کہ نذیر احمد کی تحریروں کے ساتھ ہی داستان نویسی کو زوال آیا اور تمثیل اور حکایت کے ذریعہ نصیحت کرنے کا سلسلہ بھی ختم ہوگیا بلکہ شعوری طور پر انگریزی زبان کی صنف یعنی ناول نگاری سے عدم واقفیت کے باوجود بھی ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے قصوں کے ماحول میں ایسے رچاؤ کو شامل کیا جو ان کی اپنی سرزمین یعنی دہلی کا ماحول تھا' اس لئے ان کے قصوں کو ناول ہی کہا جائے گا۔ اس کے ذریعہ داستان، تمثیل یا حکایت کی نمائندگی ہونے کا کوئی جواز ہی پیدا نہیں ہوتا۔

علامہ راشد الخیری چوں کہ ڈپٹی نذیر احمد کے تربیت یافتہ تھے اور ان سے تحریر کے انداز کا سلیقہ سیکھا تھا۔ اسی لئے علامہ راشد الخیری کے ناولوں میں بھی صرف خواتین کی تعلیم و تربیت کے مسائل ہی نہیں' بلکہ عورت کی زندگی کے اُن عوامل کو شامل کیا گیا ہے جس کا تعلق کسی حد تک مرد کی دنیا سے بھی برقرار ہے لیکن عورت کی زندگی اور اس کے مسائل ہی نہیں' بلکہ سماج اور معاشرے میں اس کے وقار کو برقرار رکھنے کے لئے اختیار کئے جانے والے طریقوں کو علامہ راشد الخیری نے انہی نکات کے پس منظر میں نمائندگی دی جس پس منظر میں ڈپٹی نذیر احمد نے ناول نگاری کی ابتدا کی تھی۔ اس طرح ناول کے فن اور اس کے انداز کو اختیار کرنے کے معاملے میں راشد الخیری نے اپنے پیش رو اور اردو کے اولین ناول نگار ڈپٹی نذیر احمد کے خیالات اور ان کے اظہار کی عکاسی ضرور کی لیکن اس میں صرف دہلی کا ماحول ہی نہیں' بلکہ عورت کے معاشرہ کی کئی قسم کی جھلکیاں واضح ہوتی ہیں۔

غرض ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں کے بارے میں یہ تصور کیا جاتا ہے کہ ان کے قصے، داستاں اور ناول کی درمیانی کڑی ہے۔ لیکن فنی تقاضوں کے ذریعہ ثابت کیا جاچکا ہے کہ نذیر احمد کے قصوں میں نہ تو داستانوی عناصر کا پتہ چلتا ہے اور نہ ہی ماحول کے معاملے میں وہ تمثیل کے ماحول سے استفادہ کرتے ہیں۔ بلکہ حکایت کی خصوصیت کو بھی نظر انداز کر کے ''ارضی خصوصیات'' This worldliness کو شامل کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہی تصور کیا جائے گا کہ ایسی تحریریں جن میں کردار اور ماحول کو

www.urduacademyts.com

زماں ومکاں سے وابستہ کردیا جائے تو اس انداز کو سوائے ناول کے اور کوئی نام نہیں دیا جاسکتا۔ داستانوں، تمثیلوں اور حکایات میں زماں ومکاں کی قید نہیں ہوتی جبکہ ناول کے لئے باضابطہ کسی دور اور کسی مقام کے معاملات کی پیشکشی ہی زماں ومکاں کا درجہ حاصل کرلیتی ہے۔ اس لئے اردو میں ناول نگاری کے آغاز سے قبل مروجہ نثری اصناف میں باضابطہ حکایت Fable، درایت Parable، تمثیل Allegory، اساطیر Myths (دیومالا)، داستاں Legend، جاتک کتھائیں Ceremony Tales، پریوں کی کہانیاں Ferry Tales اور ساگا Saga کی روایت بلاشبہ داستانوں سے مربوط ہے۔ جبکہ ناول کے ذریعہ کسی نہ کسی علاقے اور کسی نہ کسی دور کی نمائندگی ہوتی ہے' اس لئے ناول کو بالکلیہ علاحدہ صنف کا درجہ حاصل ہے۔ اردو زبان میں ڈپٹی نذیر احمد نے جس قسم کے ناول نگاری کے رویے کو فروغ دیا اُسی انداز کو علامہ راشدالخیری نے اختیار کیا۔ غرض اردو میں ناول نگاری کی روایت انگریزی ادب کے ناولوں کے ذریعہ فروغ پائی ہے۔ اس سلسلہ میں ناول کی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے انسائیکلوپیڈ، یا کے مرتبین نے اردو ناول پر اپنا محاکمہ اس انداز سے کیا ہے۔

''ناول۔ اردو: یوروپ میں نشاۃ ثانیہ کے بعد علم و ادب کے فروغ کے ساتھ ناول کا جنم ہوا۔ نئے نظام فکر وعمل کی تفسیر وتشریح کے لئے ایک جدید صنف ادب درکار تھی جو ناول کی شکل میں سامنے آئی۔ ہندوستان میں انگریزوں کے تسلط نے زندگی کے مختلف شعبوں کی طرح ادب کو بھی متاثر کیا۔ اردو میں 1857ء سے قبل ناول کا رواج نہ تھا۔ جب زندگی کے ہر شعبہ میں انقلاب آیا، ادب کی نئی صنفوں کو بھی ابھرنے کا موقع ملا تو مغربی افکار کے ساتھ ساتھ مغربی اصناف نے بھی لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ اردو میں ناول کا دور انگریزی ادب کی مقبولیت کا ہی نتیجہ تھا۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے حالات بھی ایسے تھے کہ یہاں کے ادیبوں کو ناول کی صنف میں اپنے اظہار کا ایک موثر ذریعہ مل گیا۔ (جامع اردو انسائیکلوپیڈیا (1)، مطبوعہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی' 2003ء۔ صفحہ:542)

ناول کی تاریخ کے پس منظر میں اردو ادب کا ذخیرہ اور اس میں ناول کی صنف کو اہم مقام دینے کے معاملہ میں اردو کے محققین اور ناقدین نے ہر قسم کے مباحث کے بعد جو نتائج اخذ کئے ہیں' ان کی تفصیلات بھی ادب کے پس منظر میں نمایاں کی گئی ہیں۔ جس کا تحقیقی رویہ اردو انسائیکلوپیڈیا میں اس طرح پیش کیا گیا ہے۔

اردو ناول کے بیشتر ناقدین نے نذیر احمد کو اردو کا پہلا ناول نگار تسلیم کیا ہے۔ اگرچہ نذیر احمد کے ناولوں کو کچھ لوگ تمثیلی قصوں کا نام دیتے ہیں۔ یہ قصے مغربی ناول کے معیار پر پورے نہیں اترتے۔ نذیر احمد کے ناولوں میں مرأۃ العروس، بنات النعش، توبۃ النصوح، ابن الوقت، اور فسانۂ آزاد میں اختلاف رائے ہے۔ نذیر احمد کے ناولوں کا دائرہ عمل عبدالحلیم شرر سے زیادہ وسیع ہے۔ ان کے تین ناول ''فسانۂ آزاد''، ''سیر کہسار'' اور ''جام سرشار'' مشہور ہیں۔ ان میں ''فسانہ آزاد'' اردو ناول کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتا ہے کہ اس کی بدولت ایک خاص عہد کا لکھنؤ آج بھی زندہ ہے۔ عبدالحلیم شرر نے شعوری طور پر ناول کے فن کو سمجھنے

www.urduacademyts.com

اور برتنے کی کوشش کی۔ان کی اہمیت اس میں ہے کہ انہوں نے والٹر اسکاٹ کی طرح تاریخی ناول نگاری کو رواج دیا۔ ان کے ناولوں میں ''فردوس بریں''، ''ملک العزیز ورجنا''، ''بابک خری''، ''حسن کا ڈاکو''، قیس ولبنیٰ''، ''فلورا فلورنڈا'' اور ''دربار حرام پور'' قابل ذکر ہیں۔محمد ہادی رسوا بہت ذہین اور طبّاع تھے۔ غیر معمولی تخلیقی صلاحیتوں سے مالا مال تھے۔ان کا شاہکار ناول ''امراؤ جان ادا'' (1899) ہے جس سے نفسیاتی اور تجزیاتی ناول کا آغاز ہوا۔ امراؤ جان ادا ایک طوائف کی کہانی ہے اور اس کا پس منظر لکھنؤ کا وہی انحطاط پذیر معاشرہ ہے جس کی مصوری نذیر احمد نے ''فسانہ آزاد'' میں کی ہے۔اس ناول کے ذریعہ ادبی اور شاعرانہ قدروں کو بھی ایک وسیع مفہوم ملا۔ رسوا کے دوسرے ناول اختری بیگم، ذات شریف، افشائے راز اور شریف زادہ ہیں۔ (جامع اردو انسائیکلوپیڈیا (1)، مطبوعہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی' 2003ء۔صفحہ:542)

اردو کے چند ممتاز اور قابل اعتماد ناول نگاروں کے تعارف کے ذریعہ اردو ناول نگاری کی تاریخ کی نمائندگی کرتے ہوئے باضابطہ انسائیکلوپیڈیا کے مرتبین نے صرف اردو ناول کی تاریخ کو ہی منظر عام پر نہیں لایا بلکہ اس کے ساتھ اردو ناول کی ترقی کے دوران کے زمانہ اور اس کے محرکات کو بھی بھرپور نمائندگی دی ہے۔

''یہ وہ زمانہ تھا جب اہم ادبی رجحانات، تحریکیں اور تصورات ہندوستان کی سیاسی، سماجی اور معاشرتی زندگی کو متاثر کررہے تھے۔ حال کی پستی کے احساس سے نکلنے اور ایک نیا حوصلہ بیدار کرنے کے لئے اپنے آپ کو نئے سرے سے سمجھنے کی روش عام ہوئی۔ قومیت اور وطن پرستی بھی اس دور کا اہم رجحان بنتی جارہی تھی۔ان رجحانات کی عکاسی اودھ پنچ کے ایڈیٹر منشی سجاد حسین کے ناولوں میں ملتی ہے جو صحافی بھی تھے اور ناول نگار بھی۔ان کے قابل ذکر ناول حاجی بغلول، احمق الذیں اور کایا پلٹ ہیں۔ قاضی سرفراز حسین نے آٹھ ناول لکھے جن میں شاہد رعنا اور بہار عیش سرفہرست ہیں۔ان کے تمام ناولوں کا موضوع طوائفوں کی زندگی اور ان کی اصلاح ہے۔ راشد الخیری نے طبقہ نسواں کی فلاح و ترقی کو اپنا مسلک بنایا۔انہیں بیگماتی زبان پر عبور تھا۔ وہ ''مصور غم'' کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں۔ان کے ناولوں میں عروس کربلا، آمنہ کا لال' سمرنا کا چاند، نوحہ زندگی، سیدہ کا لال اور شام زندگی کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ نیاز فتح پوری اور سجاد حیدر یلدرم کے رومانوی تصورات ان کے باغیانہ رجحان کی بھی نمائندگی کرتے ہیں۔ نیاز نے اردو میں تصوراتی ناول لکھنے کی بنیاد ڈالی۔ ان کے دو ناول ''شہاب کی سرگزشت'' اور ''ایک شاعر کا انجام'' مشہور ہیں۔ان ناولوں میں ان کی شاعرانہ فلسفیت اور انشاء پردازی نمایاں ہیں۔ یلدرم نے ترکی ادب کے اثرات قبول کئے اور اردو فکشن میں بعض نئے عناصر کا اضافہ کیا۔ (جامع اردو انسائیکلوپیڈیا (1)، مطبوعہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی' 2003ء۔صفحہ:542)

☆☆☆

برکت صدیقہ
ریسرچ اسکالر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد
موبائل: 8297914542

www.urduacademyts.com

تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی کی ویب سائٹ۔ایک جائزہ

اکیسویں صدی معلومات کے انقلاب کی صدی ہے۔انفارمیشن ٹیکنالوجی کے فروغ نے معلومات میں حیرت انگیز انقلاب پیدا کیا ہے اور انٹرنیٹ کی خدمات کے ذریعے ہم گھر بیٹھے اپنے فون یا کمپیوٹر کے اسکرین پر اپنی مطلوبہ معلومات جو انٹرنیٹ کے ذخیرے میں موجود ہوں ان تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔درکار معلومات کی بروقت گھر بیٹھے فراہمی سے ہمیں معلومات بروقت اور آسانی سے مل جاتی ہیں اور ہمارے کام میں آسانی پیدا ہوتی ہے۔انٹرنیٹ دراصل دنیا بھر میں موجود کمپیوٹرس کا ایک بین الاقوامی جال ہے جسے ورلڈ وائڈ ویب. www کے ذریعے دیئے گئے ویب سائٹ کے پتے سے ہم ایک دوسرے سے جڑ سکتے ہیں۔اور اپنی معلومات تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔انٹرنیٹ کے مشہور سرچ انجن گوگل' یاہو' او پیرا اور انٹرنیٹ ایکسپلورر وغیرہ ہیں۔جن کی مدد سے اپنی درکار معلومات کا نام یا کسی مقررہ ویب سائٹ کا پتہ لکھنے پر ہم کسی ادارے کی ویب سائٹ تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں اور درکار معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ایک زمانہ تھا جب خدمات فراہم کرنے والے ادارے اپنے ادارے کی تفصیلات پر مبنی اشتہار شائع کر کے لوگوں میں تقسیم کرتے تھے یا اخبارات کے ذریعے اپنی خدمات پر مبنی اشتہارات اور تعارفی مضامین و اعلانات شائع کراتے ہوئے لوگوں اور صارفین تک اپنی خدمات کا تعارف پیش کرتے تھے۔تاہم اب انٹرنیٹ کے آجانے سے لوگ اپنے اداروں کی خدمات کا تعارف اب اپنے ادارے کی ویب سائٹ کے ذریعے کرنے لگے ہیں اور لوگ بھی گوگل سرچ انجن میں اپنی مطلوبہ معلومات کے لیے کوئی خاص لفظ ٹائپ کرتے ہوئے اہم ویب سائٹ تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں۔معلومات کی فراہمی میں ویب سائٹ کا اہم کردار ہے۔ایک ویب سائٹ دراصل کسی ادارے کے تعارف کا صفحہ ہوتا ہے۔جس میں ادارے سے متعلق تمام تفصیلات ہوتی ہیں۔اب انسانی زندگی کے جتنے شعبے ہیں۔ان سب کی ویب سائٹ انٹرنیٹ پر دستیاب ہے۔تعلیمی ادارے' اخبارات' فلم' کھیل' سیاست' تجارت' سائنس وٹیکنالوجی' سماجی علوم اور ای کامرس۔غرض زندگی کے ہر شعبے کی ویب سائٹ ہمیں انٹرنیٹ سرچ انجن میں مل جاتی ہے۔انٹرنیٹ پر معلومات فراہم کرنے والی اہم سائٹ وکی پیڈیا پر ویب سائٹ کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

''ویب سائٹ ایک انٹرنیٹ سروس ہے جو صارفین کی درخواست پر صفحات ویب کی توثیق (آرکیو) کرتی ہے۔مصنفین اور مضمون نگاران اپنی تصنیفات اور مضامین میں جب کسی ایسے حوالہ کا تذکرہ کرتے ہیں جو آن لائن دستیاب ہوں،تو ویب سائٹ کے ذریعہ اس حوالہ کے ویب صفحہ کی توثیق کر لیتے ہیں اور حوالہ کے اصل یو آر ایل کے ساتھ اس توثیق شدہ صفحہ کا حوالہ بھی فراہم کرتے ہیں۔کیونکہ ویب صفحات ہر لمحہ تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔عین ممکن ہے کہ حوالہ شدہ صفحہ کسی تبدیلی کا شکار ہو اور حوالہ دہی کا مقصد ختم ہو جائے۔یہ تبدیلی عارضی بھی ہوتی ہے اور دائمی بھی''۔(وکی پیڈیا۔انٹرنیٹ ویب سائٹ)

ویب سائٹ دراصل ادارے کی جانب سے فراہم کی جانے والی خدمات کا بھرپور تعارف کا صفحہ ہوتا ہے۔ویب سائٹ ڈاٹ کام یا ڈاٹ ان اقسام کی بنائی جاتی ہیں۔ویب سائٹ کا ایک یو آر ایل ڈومین نام ہوتا ہے جو کم سے کم الفاظ میں ہوتا ہے تاکہ ویب صارفین کو آسانی سے مطلوبہ سائٹ تک رسائی مل سکے اور خدمات فراہم کرنے والا ادارہ زیادہ سے زیادہ صارفین تک رسائی حاصل کر سکے۔ویب سائٹ کی افادیت کے پیش نظر اردو اخبارت' رسائل' اردو کے اداروں اور انجمنوں نے بھی اپنی اپنی ویب سائٹ تیار کی ہیں۔ہندوستان میں اردو کے اہم اداروں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان' غالب اکیڈیمی' انجمن ترقی اردو کے علاوہ ریاستی اردو اکیڈیمیوں کی ویب سائٹ انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی دستیاب ہیں۔

ہندوستان کی اردو اکیڈیمیوں میں جس اردو اکیڈیمی کی ویب سائٹ زیادہ فعال اور جاذب نظر ہے وہ تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی کی ویب سائٹ ہے۔جس کا ویب ایڈریس https://urduacademyts.com ہے۔اس کے علاوہ گوگل میں تلنگانہ اردو اکیڈیمی بھی سرچ کیا جائے تو اردو اکیڈیمی کی اس ویب سائٹ تک رسائی حاصل کر سکتی ہے۔تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی گزشتہ دو سال سے کافی فعال ہے اور اردو زبان وادب کے فروغ میں اپنے اختراعی پروگراموں کے ذریعے ملک کی سبھی اردو اکیڈیمیوں سے سبقت لے چکی ہے۔اکیڈیمی کے موجودہ سکریٹری ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد غوث صاحب نے جب سے اردو اکیڈیمی میں اپنی خدمات کا آغاز کیا ہے وہ صدر نشین اردو اکیڈیمی ڈاکٹر محمد رحیم الدین انصاری صاحب کے مشوروں سے اکیڈیمی میں عصری تقاضوں کے حامل فروغ اردو کے اہم کام انجام دے رہے ہیں۔چنانچہ اردو اکیڈیمی کی ایک جامع اور دیدہ زیب ویب سائٹ کا دیرینہ تقاضہ بھی 2019ء میں مکمل ہو سکا جب کہ ڈاکٹر محمد غوث نے تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی کی خدمات کو عالمی سطح پر اردو میں متعارف کرانے کے لیے اردو کی ایک ڈائنامک ویب سائٹ کی تیاری کا آغاز کیا اس کے لیے انٹرنیٹ پر یونیکوڈ میں مہارت رکھنے والے انجینیر سید مکرم نیاز مدیر ''تعمیر نیوز'' کی خدمات حاصل کی گئیں۔اکیڈیمی کی ویب سائٹ کے لیے ڈومین نام urduacademyts.com دس سال

www.urduacademyts.com

کے لیے خریدا گیا۔ اکیڈیمی کی ویب سائٹ کو بیرونی حملوں سے محفوظ رکھنے کے لیے ویب لاک کیا گیا اور اکیڈیمی کی جامع ڈائنامک ویب سائٹ تیار کی گئی۔ تلنگانہ اسٹیٹ اردو اکیڈیمی کی ویب سائیٹ کا افتتاح 2/ جون 2020 کو ریاست کے یوم تاسیس کے موقع پر کیا گیا۔ اس ویب سائٹ پر اردو اکیڈیمی کی خدمات سے متعلق تفصیلات ہیں جو اردو قارئین کے لیے دلچسپی کا موضوع ہوسکتی ہیں۔ جیسے ہی انٹرنیٹ صارفین تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی کی ویب سائٹ پر پہونچتے ہیں تو انہیں ویب سائٹ کا دیدہ زیب پہلا صفحہ دکھائی دیتا ہے جسے ہوم پیج کہتے ہیں۔ تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی کے نئے رجسٹرڈ شدہ لوگو کے بازو اردو انگریزی اور تلگو میں تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی خوش رنگ لفظوں میں دکھائی دیتا ہے۔ اوپری صفحہ پر آج کی تاریخ اور ویب سائٹ کو انگریزی اور دیگر زبانوں میں دیکھنے کے مواقع دستیاب ہیں۔ سائٹ کو فیس بک، ٹوئٹر، انسٹا گرام، یوٹیوب وغیرہ پر شئر کرنے کے مواقع دستیاب کرائے گئے ہیں۔ ویب سائٹ کے ہوم پیج پر دائیں جانب حرکت کرتی ہوئی تصاویر کا خانہ ہے۔ جس میں اکیڈیمی کے زیر اہتمام منعقد ہونے والی تازہ ترین تقاریب کی رنگین تصاویر کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ بائیں جانب ریاستی وزیر اعلیٰ جناب کے چندر شیکھر راؤ، وزیر اقلیتی بہبود جناب کوپولہ ایشور، تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی کے صدر نشین ڈاکٹر محمد رحیم الدین انصاری صاحب اور ڈائرکٹر سکریٹری اردو اکیڈیمی کی تصاویر دیکھی جاسکتی ہیں۔ ویب سائٹ کے ہوم پیج پر اوپر بنیادی معلوماتی ٹیب دئے گئے ہیں۔ اس ویب سائٹ کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ تمام ٹیب اردو یونیکوڈ میں دیئے گئے ہیں۔ یونی کوڈ کمپیوٹر پر زبانوں کا ایسا نظام ہے جو گوگل سرچ میں کام آتا ہے اور ہم مطلوبہ مواد تک رسائی حاصل کرسکتے ہیں چنانچہ تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی کی ویب سائٹ پر موجود مواد کو ہم اردو میں گوگل سرچ کر سکتے ہیں۔ ویب سائٹ پر جو بنیادی ٹیب دئے گئے ہیں۔ ان میں ہوم پیج۔ ہمارے متعلق، اکیڈیمی کی اسکیمات، رسائل، خبریں، تقریبات، گیلری، متفرقات، ڈاؤن لوڈ، آر ٹی آئی اور رابطہ کیجئے اور سرچ سہولت دستیاب ہیں۔ ویب سائٹ پر صدر نشین اور ڈائرکٹر کی تصاویر کے نیچے تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی کی جانب سے حال ہی میں شروع کردہ ''اردو سیکھئے آن لائن'' سرٹفکیٹ کورس کا لنک دیا گیا ہے جس سے دنیا بھر میں موجود لوگ آن لائن رجسٹریشن کرتے ہوئے تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی کی جانب سے شروع کردہ اردو ابتدائی کورس میں داخلہ لے سکتے ہیں۔ اس ضمن میں ویب سائٹ پر دس دن میں اردو سیکھئے موبائل ایپ کا لنک بھی دیا گیا ہے۔ تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی کی ویب سائٹ پر تصاویر کے خانے کے نیچے نیوز اسکرولنگ دی جاتی ہے جس میں اکیڈیمی کے تحت ہونے والے تازہ ترین پروگراموں کی تفصیل اور اہم اعلانات اردو میں اسکرول کیے جاتے ہیں۔ نیوز اسکرولنگ کے نیچے اکیڈیمی کا تعارف باکس میں دیا گیا ہے۔ ابتدائی تعارف باکس میں دکھائی دیتا ہے۔ مزید تفصیلات کو مزید پڑھئے کلک کرنے سے دیکھا جاسکتا ہے۔ ویب سائٹ پر تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی کا تعارف ان الفاظ میں دیا گیا ہے:

''تلنگانہ اسٹیٹ اردو اکیڈیمی حکومت تلنگانہ کا ایک خودمختار ادارہ ہے۔ یہ ادارہ آندھرا پردیش سوسائٹیز رجسٹریشن ایکٹ 2001 کے تحت رجسٹرڈ ہے، اس کا رجسٹریشن نمبر 197 / 2015 ہے۔ اردو اکیڈیمی کی ایک گورننگ باڈی ہوتی ہے، جس کے صدر نشین اور ارکان کو حکومت کی جانب سے نامزد کیا جاتا ہے۔ سال 2018 میں حکومت نے جناب محمد رحیم الدین انصاری کو صدر نشین اور حکومت تلنگانہ کے افسران بشمول ڈائرکٹر، چار ارکان کو نامزد کیا ہے۔ اردو اکیڈیمی کا بنیادی مقصد ریاست میں اردو زبان وادب کو فروغ دینا، اس کے تحفظ، ترویج اور توسیع کے لئے فضاء کو ہموار کرنا ہے۔ اکیڈیمی کی سرگرمیوں کا دائرہ کار شعراء، ادباء، قلمکاروں، اردو کے کاز کے لئے کام کرنے والے اداروں، تنظیموں، اردو طلبہ، اردو صحافیوں، اردو اخبارات اور اردو خبر رساں اداروں تک ہے۔ اردو اکیڈیمی پوری سنجیدگی کے ساتھ علمی وادبی سرگرمیاں انجام دیتی آرہی ہے۔ حکومت تلنگانہ اردو اکیڈیمی کو اردو زبان وادب اور تہذیب وثقافت کے تحفظ اور فروغ کے لئے، ساتھ ہی شادی خانوں کی تعمیر کے لئے فنڈس جاری کرتی ہے۔ تلنگانہ اسٹیٹ اردو اکیڈیمی فروغ اردو کے کئی کاموں کو انجام دے رہی ہے۔ جن میں اردو زبان وادب کی نامور ہستیوں کے نام سے ایوارڈز، بیسٹ اردو ٹیچر و بیسٹ اردو اسٹوڈنٹ ایوارڈز، اردو اکیڈیمی کے ترجمان ماہنامہ قومی زبان کی اشاعت، اردو ادیبوں شاعروں و اردو اسکالرس کی کتابوں کی اشاعت کے لئے جزوی مالی اعانت، اردو لائبریریز کی اعانت، اردو اخبارات، رسائل اور جرائد کی مالی اعانت، اردو خبر رساں اداروں کی مالی اعانت، اردو قلم کاروں اور صحافیوں کی اعانت، مطبوعہ کتابوں پر انعامات اور دیگر اسکیمات شامل ہیں۔ اردو اکیڈیمی جناب محمد رحیم الدین انصاری صدر نشین تلنگانہ اسٹیٹ اردو اکیڈیمی کی نگرانی میں اپنی اسکیمات و پروگرامس کی بڑی خوبی اور پوری شفافیت کے ساتھ عمل آوری کر رہی ہے۔ صدر نشین صاحب خود ایک بہترین اردو داں ہیں۔ وہ شہر اور اضلاع میں فروغ اردو کے مختلف پروگرامس میں بذاتِ خود شریک ہوتے ہیں اور فلاحی، سماجی و تعلیمی اداروں کی ہمت افزائی کرتے ہیں۔

اردو اکیڈیمی اردو زبان وادب کو عصر حاضر کے مطابق ڈھالنے، اردو کو سائنس اور سماجی علوم سے مربوط کرنے کی منصوبہ بندی کر رہی ہے۔ حکومت نے سال 2012 میں اردو اکیڈیمی کو انٹرمیڈیٹ کی نصابی کتابوں کی اشاعت کی ذمہ داری دی ہے۔ اکیڈیمی اس کوشش میں ہے کہ انڈر گرائجویٹ و گرائجویٹ کے سماجی علوم، سائنس وٹکنالوجی کی نصابی کتابوں کی اشاعت بھی اردو اکیڈیمی کے تحت عمل میں لائی جائے۔ سابق میں اردو اکیڈیمی کے زیر اہتمام اردو زبان کے تحفظ، فروغ، ترقی و

www.urduacademyts.com

ترویج کے ضمن میں سال 2008 میں ای۔ٹی وی اردو کے اشتراک سے ''آؤ اردو سیکھیں'' پروگرام چلایا گیا تھا، اس پروگرام 54 ممالک میں ٹیلی کاسٹ کیا گیا۔اس پروگرام کو پھر سے جاری کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔علاوہ ازیں اردو زبان وادب کی ترقی میں مزید پیش رفت کے لئے نئی اسکیمات جاری کروانے کی راہیں تلاش کی جارہی ہیں''۔

تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی کے اس تعارف سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح اردو اکیڈیمی مختلف علمی وادبی سطحوں پر ریاست میں اردو کے فروغ کے لیے کام کررہی ہے۔اس تعارف سے اندازہ ہوتا ہے کہ تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی ایک فعال ادارہ ہے اور ملک کی دیگر اردو اکیڈیمیوں کے لیے مشعل راہ ہے۔تعارف کے نیچے اردو اکیڈیمی کے موجودہ اور سابق صدور نشینوں کے نام دیئے گئے ہیں 1976 تا 2018 اردو اکیڈیمی کے تمام صدور نشینوں کے نام اس طرح ہیں:

جناب آصف پاشاہ، ایم باگاریڈی، جناب حافظ ابو یوسف، جناب مرزا وحید احمد بیگ، جناب ڈاکٹر شیخ دادے صاحب' جناب جلیل پاشاہ، جناب سید رحمت علی، جناب انصر بیگ، جناب سید شاہ نورالحق قادری، جناب ابراہیم بن عبداللہ مسقطی، جناب محمد رحیم الدین انصاری

اس فہرست سے اندازہ ہوتا ہے کہ سابق ریاست آندھراپردیش اور اب ریاست تلنگانہ کے کل صدور نشینوں کی تعداد بارہ (12) ہے۔

اسی طرح موجودہ اور سابق ڈائرکٹر/اسکریٹریز کے نام دیئے گئے ہیں جو اس طرح ہیں:

جناب بھارت چندر کھنہ، جناب چندر سریواستو، جناب خلیل الرحمٰن، جناب جلیل امرت، جناب ایم اے رشید ارشد، جناب جی منوہر راؤ، جناب ایم اے منان ، جناب ایم اے رشید، جناب محمد مسعود بن سالم، جناب اقبال مظفر احمد، جناب شیخ مظفر الدین، جناب غوث محی الدین ، جناب اعجاز قریشی، جناب عبدالکریم، جناب مسعود بن سالم، جناب ایم اے نعیم، جناب ایم اے منان، جناب محمد صدیق، جناب ایم اے نعیم، جناب محمد صدیق، جناب شجاعت علی، جناب فائق احمد، جناب محبوب خان، جناب فائق احمد، جناب فہیم صابری، جناب محمد رضی الدین شاکر، پروفیسر ایس اے شکور، جناب محمد وحید الدین آئی ایف ایس، جناب بی۔شفیع اللہ آئی ایف ایس، جناب شاہنواز قاسم آئی پی ایس اور ڈاکٹر محمد غوث صاحب 2019 سے تاحال۔

تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی کی ویب سائٹ کے ہوم پیج پر تعارف کے نیچے اکیڈیمی کی جانب سے جاری ہونے والے رسالے قومی زبان کا لنک دیا گیا ہے۔لنک کے صفحے پر اعلان نظر آتا ہے کہ ''قومی زبان'' کی ذیلی ویب سائٹ جلد ہی منظر عام پر آرہی ہے۔تاہم اس صفحہ پر قومی زبان سے متعلق حسب ذیل تفصیلات ملتی ہیں۔

''ہر ماہ کے شمارے کے فہرستِ مضامین والے صفحہ کے ذریعے ہر مضمون کا علیحدہ سے مطالعہ کیا جاسکے گا۔فہرستِ مضامین والے صفحہ پر سب سے اوپر متعلقہ شمارہ کے ٹائیٹل کی تصویر ہوگی۔سابقہ شائع شدہ تمام شمارہ جات کا آن لائن مطالعہ بآسانی ممکن ہوگا۔پی۔ڈی۔ایف [pdf] فائل کی شکل میں ہر شمارہ ڈاؤن لوڈ بھی کیا جاسکے گا۔ہر مصنف کی تمام تخلیقات کا ریکارڈ دیکھا جاسکے گا اور ان تخلیقات کا مطالعہ بھی کیا جاسکے گا۔کسی بھی لفظ کی تلاش ممکن ہوگی اور تلاش کے نتیجے والا صفحہ، قاری کو بتائے گا کہ اس کی تلاش کا لفظ کس مصنف کے کس مضمون اور کس شمارے میں شامل ہے؟ اور اس مضمون کا فوری مطالعہ بھی ممکن ہوگا۔قاری کو رسالے کی ہر تحریر پر تبصرہ کرنے کی سہولت حاصل ہوگی جو کہ متعلقہ تحریر کے نیچے شائع ہوگا۔ہر مضمون کو سوشل میڈیا (فیس بک، ٹوئٹر، انسٹاگرام وغیرہ) پر ایک کلک کے ذریعے شئر کرنے کی سہولت دستیاب رہے گی۔دیگر مختلف، متنوع ومنفرد تکنیکی خصوصیات۔

قومی زبان کے شماروں میں شامل مضامین کو یونی کوڈ میں پیش کرنے کے لیے پیشرفت جاری ہے تاہم قومی زبان کے ذیلی ٹیب کے تحت سال 2018 اور 2019 کے منتخب شماروں کی پی ڈی ایف ویب سائٹ پر دستیاب ہے۔جب کہ دنیا بھر کے قارئین قومی زبان' ریسرچ اسکالرز اور محبان اردو کا مطالبہ ہے کہ ہر ماہ کے اختتام پر ''قومی زبان'' کو پابندی کے سے پی ڈی ایف کی شکل میں آن لائن اکیڈیمی کی ویب سائٹ پر پابندی سے دستیاب کرایا جائے۔اس جانب اکیڈیمی کے ذمہ دار کام کررہے ہیں۔

تلنگانہ اسٹیٹ اردو اکیڈیمی کی جانب سے ہر سال نامور قومی، سماجی، ادبی شخصیات، اسکالرس اور زبان وادب کی ممتاز ہستیوں میں سے ایک شخصیت کو "مولانا ابوالکلام آزاد" ایوارڈ دیا جاتا ہے۔یہ قومی ایوارڈ ہے جو دو لاکھ پچیس ہزار روپئے (2,25,000) نقد، توصیف نامہ اور میمنٹو پر مشتمل ہے۔ایوارڈ کے لئے شخصیت کا انتخاب اکیڈیمی کی جانب سے تشکیل کردہ ماہرین پر مشتمل کمیٹی کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔

نوٹ: اس ایوارڈ کی رقم سال 2008 تا 2015 کے دوران، ایک لاکھ پچیس ہزار (1,25,000) مختص رہی ہے۔

ویب سائیٹ با تک کتنی شخصیتون کو کس سن میں ایوارڈ عطاء کیا گیا ہے ان تمام کی تفصیلات موجود ہیں ۔مضمون کی طوالت لے پیش نظر اس سے اجتناب کیا جا رہا ہے۔مخدوم ایوارڈ کے تحت حسب ذیل تفصیلات پیش کی گئی ہیں:

www.urduacademyts.com

مخدوم ایوارڈ: تلنگانہ اسٹیٹ اردو اکیڈیمی مخدوم ایوارڈ کے نام سے ہر سال ایک ایوارڈ ہندوستان کے کسی ایک ادیب، شاعر، صحافی، اسکالر، محقق، نقاد یا مزاح نگار کو عطا کرتی ہے۔ یہ ایوارڈ دو لاکھ (2,00,000) روپے نقد، توصیف نامہ اور مومنٹو پر مشتمل ہے۔ ایوارڈ کے لئے شخصیت کا انتخاب اکیڈیمی کی جانب سے تشکیل کردہ ماہرین پر مشتمل کمیٹی کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔

شاعری علی سردار جعفری۔

کارنامہ حیات ایوارڈ اردو اکیڈیمی تلنگانہ کا ایک باوقار ایوارڈ ہے اس ایوارڈ کی تفصیلات ویب سائٹ پر اس طرح پیش کی گئی ہیں:

کارنامہ حیات ایوارڈ: ادیبوں، اسکالروں، شاعروں، صحافیوں اور اردو زبان وادب کے فروغ کے سلسلہ میں کام کرنے والے اصحاب کی خدمات کو خراج پیش کرنے، تلنگانہ اسٹیٹ اردو اکیڈیمی کی جانب سے مختلف زمروں میں سات ایوارڈ دیئے جاتے ہیں جو حسب ذیل ہیں:

1) شاعری: حضرت امجد حیدر آبادی ایوارڈ، 2) شاعری: سعید شہیدی ایوارڈ' 3) نثر: آغا حیدر حسن ایوارڈ' 4) تنقید و تحقیق: ڈاکٹر محی الدین قادری زور ایوارڈ، 5) تعلیم و تدریس: پروفیسر حبیب الرحمٰن ایوارڈ' 6) صحافت: محبوب حسین جگر ایوارڈ، 7) فروغ اردو: سری نواس لاہوٹی ایوارڈ

ان ایوارڈز کے لئے شخصیات کے انتخاب کے سلسلہ میں ایک کمیٹی تشکیل دی جاتی ہے جو اردو اسکالرس، ادیبوں، شعراء اور فروغ اردو کے سلسلہ میں کام کرنے والے نامور اصحاب پر مشتمل ہوتی ہے۔ مذکورہ کمیٹی متفقہ طور پر ایوارڈز کے لئے شخصیات کا انتخاب کرتی ہے۔ مذکورہ ایوارڈ فی کس پچاس ہزار روپے (50,000) اور توصیف نامہ پر مشتمل ہے۔

تحقیق وتنقید: ڈاکٹر محی الدین قادری زور ایوارڈ، تعلیم وتدریس: پروفیسر حبیب الرحمٰن ایوارڈ، صحافت: محبوب حسین جگر ایوارڈ اور فروغ اردو: سری نواس لاہوٹی ایوارڈ۔

بیسٹ اردو اسٹوڈنٹ ایوارڈ کی تحت تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی کی جانب سے ریاست کے تمام اضلاع سے اردو میڈیم ایس ایس سی میں سرفہرست اعلیٰ نشانات حاصل کرنے والے طلباء وطالبات کو نقد رقم کی شکل میں ایوارڈ دیئے جانے کی تفصیلات معہ ایوارڈ یافتگان کے ناموں کے درج ہے۔ جسے اکیڈیمی کی ویب سائٹ کے ہوم پیج پر دیکھا جاسکتا ہے۔

تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی کی ویب سائٹ کے ہوم پیج پر نیچے کی جانب تصاویر اور ویڈیوز کی شکل میں اکیڈیمی کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے مختلف پروگرام جیسے تلنگانہ کے ڈگری کالجوں میں اردو میڈیم کورسز کی بحالی کے لیے وزیر داخلہ جناب محمد محمود علی صاحب سے مشاورتی اجلاس' عالمی یوم مادری زبان کے ضمن میں منعقدہ اردو پروگرام' تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی کے رسائل کی خریداری مہم کی تفصیلات اور دیگر پروگراموں کی خبریں' تصاویر اور ویڈیوز پیش کیے گئے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر محمد رحیم الدین انصاری صاحب کی صدارت اور ڈاکٹر محمد غوث صاحب کی معتمدی میں تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی فعال رہی اور فروغ اردو کی سرگرمیاں انجام دیتی رہی۔ ہوم پیج کے دوسری جانب نیچے تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی کی جانب سے ادیبوں اور شعراء کی ڈائرکٹری شائع کی گئی تھی اس ڈائرکٹری میں شامل شعراء ادیب' صحافی اور دانشوروں کے نام دیکھے جاسکتے ہیں۔ بائیں جانب اوپر اکیڈیمی کی سرگرمیوں کے لنک اور فیس بک پیج کا لنک دیا گیا ہے نیچے حسب روایت اردو اکیڈیمی کے رابطے سے متعلق اہم تفصیلات دی گئی ہیں جو کسی بھی جامع ویب سائٹ کا حصہ ہوتی ہیں۔ تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی کی ویب سائٹ کے ہوم پیج کے دوسرے ٹیب ہمارے متعلق میں اردو اکیڈیمی کی تاریخ وتعارف کے بعد اکیڈیمی کی گورننگ کونسل کا نقشہ دیا گیا ہے جس میں صدر نشین اور ڈائرکٹر کے بعد ارکان عملہ کی تفصیلات بہ اعتبار عہدہ دی گئی ہیں۔ تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی ایک سرکاری ادارہ ہے اس لیے اس کے کام کاج تمام سرکاری اصول وضوابط کے مطابق انجام پاتے ہیں۔ ارکان عملہ کے تحت اکیڈیمی میں برسرکار ملازمین کی تفصیلات بھی ویب سائیٹ پر ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔

اردو اکیڈیمی اسکیمات کے تحت اکیڈیمی کی جانب سے فروغ اردو کی مختلف اسکیمات کا تعاف پیش کیا گیا ہے۔ اردو اکیڈیمی کی اسکیمات میں اردو زبان و ادب کا تحفظ وترویج' ماہنامہ قومی زبان اور بچوں کے ستارے رسائل کی اشاعت' مولانا ابوالکلام آزاد ایوارڈ' مخدوم ایوارڈ' کارنامہ حیات ایوارڈ' بیسٹ اردو ٹیچر ایوارڈ' بیسٹ اردو اسٹوڈنٹ ایوارڈ' اردو کی شائع شدہ مطبوعات پر انعامات' اردو سے متعلق جاری اسکیمات کے بارے میں معلومات فراہم کرنا' اردو خبر رساں اداروں کو مالی امداد' اردو ادیبوں' اسکالروں اور شعراء کی تخلیقات کی اشاعت کے لیے جزوی مالی امداد' اردو لائبریریوں کو کتابوں کی فراہمی' اردو اکیڈیمی کی زیر اہتمام اردو مشاعرے' سمینارس' سمپوزیمس' تہذیبی وثقافتی پروگرامس' اردو مشاعرے' سمینارس' سمپوزیمس' تہذیبی وثقافتی پروگرامس کے انعقاد کے لیے جزوی مالی امداد' سرکاری اردو مدارس کو انفرااسٹرکچر کے لیے مالی اعانت' اردو میڈیم کی نصابی کتابوں کی اشاعت' اردو گھر اور شادی خانوں کی تعمیر' اردو رسائل اور جرائد کو مالی امداد' گرمائی تعطیلات میں اردو پڑھانے اور سکھانے کے لیے رضا کارانہ تنظیموں اور اداروں کی مالی اعانت' اردو الیکٹرانک میڈیا جرنلسٹس کی مالی اعانت' اردو کتابوں کی

www.urduacademyts.com

اشاعت، جشن تلنگانہ کی تقاریب، چھوٹے اردو اخبارات کی مالی اعانت۔قومی اردواخبارات اور چینلس کو اشتہارات کی اجرائی، اردو اکیڈیمی کے جزوقتی بک اسٹالس، اردو کیلنڈرس، ڈائری، بروچرس کی اشاعت، اردو قلم کاروں اور صحافیوں کی مالی اعانت، اردو مسکن خلوت موتی گلی حیدرآباد، تلنگانہ اردو اکیڈیمی کی ویب سائٹ، عثمانیہ یونیورسٹی کے اشتراک سے اردو سیکھو سرٹفکیٹ کورس۔

تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی کی ان اسکیمات کے جائزے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو اکیڈیمی کا دائرہ کار کافی وسیع ہے اور ملک میں سب سے زیادہ سرکاری بجٹ حاصل کرنے کا موقف رکھنے والی تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی واقعی اپنی خدمات کے لیے ملک کی مثالی اکیڈیمی قرار دی جاتی ہے۔

ویب سائٹ کے ٹیب خبریں تقریبات میں اکیڈیمی کے تحت منعقد ہونے والے پروگراموں کی تفصیل دی گئی ہے۔گیلری میں تصاویر اور ویڈیو کی شکل میں اکیڈیمی کے پروگراموں کی تفصیلات نیوز اور ویڈیو کی شکل میں دی گئی ہیں اکیڈیمی کے یوٹیوب چینل کا لنک دیا گیا ہے جس میں اکیڈیمی کے تحت منعقد ہونے والے پروگراموں کے ویڈیوز پیش کیے گئے ہیں۔متفرقات کے تحت اکیڈیمی کی ویب سائٹ کی پالیسی کا ذکر کیا گیا ہے۔ڈاؤن لوڈ کے تحت اکیڈیمی کی مختلف اسکیمات کے فارم عوامی سہولت کے لیے ڈاؤن لوڈ کے لیے رکھے گئے ہیں۔آر ٹی آئی ٹیب کے تحت قانون حق معلومات کے تحت تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی میں آر ٹی آئی ذمہ داروں کی تفصیلات اور اس قانون سے متعلق اہم تفصیلات اردو میں دی گئی ہیں۔اردو اکیڈیمی کے زیر اہتمام کچھ نادر اردو کتابوں کی اشاعت بھی عمل میں لائی گئی جن میں میں مرقع چغتائی، غزلیات شاد، اردو شہ پارے، تعلیم ایک تحریک ایک چیلنج، تقدیر امم کا راز داں مولانا ابوالکلام آزاد اور مرقع حیدرآباد کا تعارف بھی اکیڈیمی ویب سائٹ کے ہوم پیج پر دیا گیا ہے۔ہوم پیج کے آخری ٹیب میں رابطہ کیجئے کے زیر عنوان حسب ذیل رابطہ تفصیلات دی گئی ہیں۔

ڈائرکٹر/سکریٹری، اردو اکیڈیمی
چوتھی منزل، حج ہاؤز، نامپلی، حیدرآباد
ای-میل:admin@urduacademyts.com
موبائل:+888601230391
فون:23237810-040

تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی کی اسی نئی جامع ویب سائٹ کے مشاہدے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو میں اکیڈیمی کی کارکردگیوں اور اکیڈیمی کی جانب سے پیش کردہ مختلف خدمات کے بارے میں بھرپور معلومات ملتی ہیں۔اردو اکیڈیمی ہونے کے ناطے اردو زبان کو فوقیت دی گئی ہے۔انگریزی میں بھی اکیڈیمی کے مشمولات کا مشاہدہ انگریزی ترجمے کی گوگل سہولت سے کیا جاسکتا ہے۔جس طرح مختلف ادارے اپنی کارکردگی کے اظہار سے قارئین اور ناظرین کو درکار معلومات کی فراہمی کے ذریعے انہیں تشفی بخشتے ہیں اسی طرح تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی کی یہ جامع ویب سائٹ اردو اکیڈیمی کا بھرپور تعارف ہے۔اس ویب سائٹ پر اگر پابندی سے قومی زبان اور روشن ستارے کو اپ لوڈ کیا جاتا رہے تو دنیا بھر کے قارئین اکیڈیمی کے ترجمان رسالوں سے مستفید ہوسکتے ہیں۔اردو اکیڈیمی کی زیر اہتمام ہر سال سو سے زائد اردو شعراء اور ادیبوں کی تخلیقات جزوی مالی امداد سے شائع ہوتی ہیں اگر ان کتابوں کو پی ڈی ایف یا یونی کوڈ کی شکل میں ویب سائٹ پر پیش کیا جائے تو اردو اکیڈیمی کی جزوی مالی اعانت سے شائع ہونے والا بڑا ادبی سرمایہ انٹرنیٹ اور اکیڈیمی کی ویب سائٹ پر محفوظ ہوسکتا ہے۔اسی طرح اکیڈیمی کی سابقہ اسکیمات اور پروگراموں کی تفصیلات بھی حاصل کر کے ویب سائٹ پر پیش کریں تو اردو اکیڈیمی تلنگانہ کی یہ ویب سائٹ اردو زبان و ادب کا ایک انمول خزانہ ثابت ہوسکتی ہے۔ اکیڈیمی کی ویب سائٹ کو بار بار اپ ڈیٹ کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے اکیڈیمی کی تازہ ترین سرگرمیوں سے اردو داں طبقے کو واقفیت حاصل ہوتی ہے۔

☆☆☆

محمد محبوب
پی ایچ ڈی، ریسرچ اسکالر، جامعہ عثمانیہ
حیدرآباد۔تلنگانہ۔فون نمبر 9440777782

www.urduacademyts.com

رشتے

علی پوا کو میں ان دنوں سے جانتا تھا جب وہ پلیڈیم سینما میں ٹکٹیں بلیک کیا کرتا تھا۔ بڑا بدصورت اور کالا بھجنگ آدمی جسکا منھ نہ ماتھا۔ چیچک نے اس کے منہ پر یوں دل کھول کر گلکاری کی تھی کہ دور سے دیکھنے پر ایسا لگتا تھا جیسے تارکول کی سڑک پر برسات کے سبب گڈھے ہی گڈھے پڑے ہوں۔ ایسے جھابڑ جھلے کو دیکھ کر اچھے اچھوں کو وحشت ہونے لگتی تھی۔ وہ جتنا بدخواور بدرو تھا اتنا ہی موذی اور ستمگر۔ ایک تو دس کی ٹکٹ پچاس میں بیچتا تھا اوپر سے ایسی اینٹھ دکھاتا تھا جیسے ٹکٹ دے کر احسان کررہا ہو۔ اس سے حیل و حجت کرنا بھڑ کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف تھا۔ ہر دم غصہ اس کی ناک پر ہوتا تھا۔ بات بات پر وہ چھری کٹاری دکھاتا یا گالی گلوچ پر اتر آتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کسی بے درد قصائی کے گھر پیدا ہوا ہو جسے پرائی پیڑا سے کوئی لینا دینا ہی نہیں۔ جو کوئی بھی اس سے الجھنے کی کوشش کرتا تھا تو اس کے گرگے اس پر یوں ٹوٹ پڑتے تھے جیسے گدھ مردار جانور پر۔ وہ مار مار کر اس کا حال حلیہ اس طرح بگاڑ کر رکھ دیتے کہ دوبارہ وہ شریف زادہ لال چوک یا اس کے آس پاس کہیں دکھائی نہیں دیتا تھا اس کی اس دادا گیری کے گواہ تو سینکڑوں لوگ ہوتے تھے پر کیا مجال کہ کوئی اسے روکنے یا ٹوکنے کا حوصلہ دکھا سکے۔ تماش بین تو تماش بین، پولیس والے بھی اس کے آگے بھیگی بلی بن کر رہتے تھے۔ دراصل اس نے لال چوک کے علاقے میں ایسی دہشت اور دبدبہ بنا کے رکھا تھا کہ کوئی اس کے خلاف منہ کھولنے کی جرات نہیں کر پاتا تھا۔ جب پانی میں رہنا ہو تو مگر مچھ سے کوئی بیر کیوں لے۔ سچ پوچھئے تو وہ لال چوک کا ایسا بے تاج بادشاہ تھا جس کی اجازت کے بنا یہاں پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سینما ہی لوگوں کی تفریح کا واحد ذریعہ تھا۔ جس دن کوئی بھی نئی فلم پلیڈیم میں لگتی تھی تو سینما دیکھنے والوں کی بھیڑ پلیڈیم پر ٹوٹ پڑتی تھی۔

فلم بینوں کے اس انبوہ کو قابو کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ پولیس اس جم غفیر کو دیکھ کر اپنے ہاتھ پہلے ہی کھڑی کر دیتی تھی۔ بھیڑ کو قابو کرنے کے لئے علی پوا اور اس کے گرگوں کی مدد لی جاتی تھی جنہوں نے اس سینما کو اپنی آماجگاہ بنالیا تھا۔ ایک بار علی پوا کی فوج میدان میں اتر گئی تو پھر اس سینما کا اچھا خاصا میدان رزمگاہ میں تبدیل ہو جاتا تھا۔

تماش بین ایسے دم دبا کر بھاگنے لگتے تھے جیسے ان کے پیچھے شکاری کتے لگے ہوں۔ مجھ جیسے لاغر اور ناتوان آدمی میدان چھوڑ کر بھاگنے میں ہی خیر و عافیت سمجھتے تھے پر کچھ جیالے ایسے بھی ہوتے تھے جنہیں علی پوا کی لاٹھیاں کھانے کا ایسا چسکا لگ چکا تھا کہ جب تک وہ دو چار ڈنڈے نہیں کھاتے تھے انہیں فلم دیکھنے میں مزہ ہی نہیں آتا تھا۔

آخر وہ تفریح کیسی جس میں درد اور تکلیف شامل نہ ہو۔ خوشی کا مزہ تب ہی دوبالا ہو جاتا ہے جب یہ رنج و غم کے بعد ملے۔ یہی حال سینما کی ٹکٹ کا بھی تھا۔ اس لاٹھی پونگا کے میدان کارزار سے سرخ رو ہونے کے بعد ہی فلم بینوں کو فلم دیکھنے میں لطف آتا تھا۔

افسانہ

www.urduacademyts.com

مجھے یاد ہے کہ ایک بار میں نے خود ٹکٹ نکالنے کی حماقت کی تھی۔ انگریزی فلم لگی ہوئی تھی۔ ٹکٹ گھر میں زیادہ رش دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے جونہی ٹکٹ کھڑکی میں ہاتھ ڈالا پتہ نہیں بہت سارے ہاتھ کہاں سے نکل آئے اور گدھ بن کر مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ اتنے سارے ہاتھ جب بیک وقت چھوٹی سی کھڑکی میں گھس گئے تو میرا کمزور ہاتھ ان ہاتھوں کے بیچ پھنس کر رہ گیا۔ میری نسیں پھٹ پڑیں۔ میں چیخنے چلانے لگا مگر میری آہ وبکا پر کسی نے کان ہی نہیں دھرا۔ میرے ہاتھ سے خون رسنے لگا، تب بھی کسی کو مجھ پر دیا نہ آئی۔ بڑی دیر کے بعد میری جان چھوٹی مگر بہت سارا خون بہانے کے بعد۔ اس دن کے بعد میں نے قسم کھائی کہ اب میں دوبارہ اس قسم کی حماقت نہیں کروں گا' بھلے ہی کھڑکی گھر میں الو کیوں نہ بول رہے ہوں۔

یہیں سے علی پوا کے ساتھ میری جان پہچان ہوگئی۔ علی پوا بلا کا مے نوش تھا۔ جب دیکھو کوٹ کی اندرونی جیب میں ایک دارو کا پوا پڑا رہتا تھا۔ گلا سوکھا نہیں کہ پوے کا ڈھکن کھولا اور کھڑے کھڑے دو تین گھونٹ نیٹ پی گیا۔ بس انہی شراب کے پوؤں کی وجہ سے اس کا نام علی پوا پڑ گیا تھا۔ دن بھر حرام کی کمائی سے اپنی جیبیں بھرتا تھا۔ کچھ اپنے اہالی موالیوں کی نذر کرتا تھا جنہیں اُس نے اپنی شان بڑھانے کے لئے پال کر رکھا تھا۔ یعنی چوہا بل میں سماتا نہیں دُم سے بندھا چھاج۔ ان سے پلا چھوٹا نہیں کہ پولیس والے منہ پھاڑ کے کھڑے ہو جاتے تھے۔ ان کی منہ بھرائی کر کے جو پیسے بچتے تھے وہ شراب نوشی یا رنڈی بازی میں چلے جاتے تھے۔ کہتے ہیں کہ کنویں کی مٹی کنویں کو ہی لگتی ہے یعنی کالی کمائی جس حرام کے راستے سے آتی ہے اسی راستے سے واپس چلی جاتی ہے۔ حرام کی کمائی کا یہ اصول ہے کہ وہ کبھی ایک جگہ ٹکتی نہیں۔ علی پوّے نے بے پناہ دولت کمائی مگر اللے تللے کر کے وہ کنگال کا کنگال ہی رہا۔ ایک دن وہ آدھی رات تک خم پر خم چڑھاتا رہا۔ جب وہ پوری طرح نشے میں غین ہوگیا تو وہ اٹھا اور جھومتے جھامتے گھر کی جانب چل پڑا۔ گہرا اندھیرا تھا۔ راستے میں کہیں جھونک آ گئی اور وہ سیدھے ایک گہری نالی میں جا گرا۔ سر پر گہری چوٹ لگی۔ یہ تو اس کی قسمت اچھی تھی کہ اتفاقاً وہاں سے ایک پولیس کی جیپ گزری جنہوں نے اُسے نالی سے نکال کر اسپتال پہونچا دیا۔ اگلے روز اس کے چیلے چانٹوں کو اس کے گھائل ہونے کی خبر لگی۔ سب لوگ اسپتال کی طرف بھاگے مگر جب دوادارو کی بات چلی تو کسی نے بھی اپنی گانٹھ گرہ ڈھیلی نہ کی۔ خرچے کا نام سنتے ہی وہ لوگ ایک ایک کر کے وہاں سے کھسکنے لگے۔ دراصل وہ خود کوڑی کوڑی کے محتاج تھے۔ یعنی آپ ہی میاں منگتے باہر کھڑے درویش۔ وہ زمانہ بڑی تنگدستی اور مفلسی کا تھا۔ ایسے لوگوں کی تعداد کچھ زیادہ تھی جنہیں پانی پینے کے لئے روز کنواں کھودنا پڑتا تھا۔ ایک روپیہ کمانے کے لئے خون پسینہ ایک کرنا پڑتا تھا۔ روپے کی بڑی قدر و قیمت تھی۔ آمدن محدود تھی پر اس تھوڑی سی آمدن میں بھی بڑی برکت تھی۔ اُن دنوں کشمیر میں بدحالی اور بھکمری کا دور دورہ تھا۔

علی پوا قبر کا منہ جھانک کر کیا آیا اس نے کالا دھندہ کرنے سے توبہ تلا کر لی۔ اس حادثے نے علی پوا کی آنکھیں کھول دیں اور وہ حلال اور حرام کی کمائی کے مراد و مطلب سمجھ گیا۔ وہ جب اسپتال سے چھوٹ کر آیا تو اس نے پلیڈیم سینما کا رخ کرنے کی بجائے ایک سیاسی دبنگ کی کوٹھی کا رخ کیا جس

www.urduacademyts.com

افسانہ

www.urduacademyts.com

میں ایک سیدھی سادھی بیوی تھی جو رام جی کی گائے تھی۔ وہ شوہر کی سیوا ٹہل کو ہی اپنی زندگی کا نصب العین سمجھتی تھی۔ کاشی وسکی گھر میں گھستے ہی اُودھم مچانے لگا تا تھا۔ کبھی بیوی کو بانجھ کہہ کر اُس کے دل وجگر کو چھلنی کر دیتا تھا تو کبھی اسے گنوار اور پھوہڑ کہہ کر ذلیل کرتا تھا۔ کبھی کھانے میں ذرا سا نقص نکال کر اسے بڑی بے رحمی سے پیٹا کرتا تھا۔ وہ بھی نہ جانے کس مٹی کی بنی ہوئی تھی کہ اتنے سارے جور و جفا کے باوجود اف تک نہ کرتی تھی۔

میں نے سوچا کہ علی پوّا اور کاشی وسکی کا ملن خوب رہے گا۔ کہنے والے بڑی بے باکی سے کہہ پائیں گے کہ ''اللہ ملائی کیا جوڑی ایک اندھا، ایک کوڑی''۔ میں نے جب علی پوّا کی ڈیوٹی کاشی وسکی کے ٹرک کے ساتھ لگا دی تو اُس نے کوئی ہو ہلا نہیں مچایا بلکہ الٹا اس نے علی پوّا کا بڑی گرم جوشی سے خیر مقدم کیا۔ دراصل کاشی وسکی علی پوّا کو بہت پہلے سے جانتا تھا۔ کہتے ہیں شرابیوں کی دوستی بڑی پکی اور اٹوٹ ہوتی ہے۔ شراب انہیں ایسے باندھ کے رکھتی ہے کہ وہ ایک دوسرے کی چھایا بن کر رہ جاتے ہیں۔ میرا خیال درست ثابت ہوا۔ کاشی وسکی اور علی پوّے میں ایسی جم گئی کہ دوسرے ملازم انہیں رشک بھری نظروں سے دیکھنے لگے۔ علی پوّا اتنا کمینہ اور بدذات ہونے کے باوجود کاشی وسکی کی ایسی سیوا ٹہل کرنے لگا کہ دوسرے کلینر انگشت بدندان ہو کر رہ جاتے تھے۔ وہ خرد ماغ اور جھگڑالو ہونے کے باوجود اپنے اُستاد کی ہر بات مان لیا کرتا تھا۔ جہاں پر رات کو ٹرک رک جایا کرتا تھا وہ بیٹھ کر کھانا بنانے لگتا تھا۔ جب کاشی وسکی دو تین پیگ پی کر ترنگ میں آجاتا تھا تو وہ علی پوّے کو بلا کر اُسے ایک آدھ پیگ پلا دیتا تھا۔ بس ایک بار دارو چل گئی تو پھر وہ دنیا و مافیہا کو بھول جاتے تھے، پر علی پوّا کتنا بھی پیے وہ اپنے ہوش و حواس بہت ہی کم کھو بیٹھتا تھا۔ وہ پی پا کے سب سے پہلے اپنے استاد کے سامنے کھانا لگا دیتا تھا۔ کاشی وسکی جیسے تیسے کر کے دو چار نوالے لے کر اوندھے پڑ جاتا تھا۔ علی پوّا اسے کھینچ کھانچ کے ٹرک تک لے آتا تھا اور پھر اُس کے سرہانے کے نیچے تکیہ رکھ کر اور اس کے اوپر کمبل ڈال کر وہ یوں مطمئن ہو جاتا تھا جیسے وہ چار دام کی تیرتھ کر کے آگیا ہو۔ کاشی وسکی اس کی فرمابرداری سے بہت خوش تھا۔ راستے میں جو بھی اوپر کی کمائی ہوتی تھی اب وہ اسے اکیلے ہضم نہیں کرتا تھا بلکہ اس نے علی پوّے کو بھی اس کمائی میں شریک بنا دیا تھا۔ علی پوّے کے دن پھر گئے تھے۔ اب تو لگی بندھی آمدن کے علاوہ بھی دوسری آمدنی کی سبیل ہو گئی تھی۔ اب اُسے کوئی بھی الٹا سیدھا دھندہ کرنے کی ضرورت نہ تھی۔

علی پوّا نے اپنی جان نثاری سے اپنے استاد کا دل اس حد تک جیت لیا کہ اب وہ اسے کبھی کبھی رات کو اپنے ساتھ گھر لے آتا تھا اور پھر اسے اپنے ہی بستر پر سلا دیتا تھا۔ دھیرے دھیرے علی پوّا کاشی کی زندگی کا جزو لاینفک بن گیا۔ گھر میں سبزی پہونچانی ہو تو علی پوّا حاضر ہے۔ جانکی کو ڈاکٹر کے پاس کبھی جانا ہو تو کاشی خود نہیں جائے گا بلکہ علی پوّے کو اس کے ساتھ بھیج دے گا۔ علی پوّا ایک بدنام زماں کردار تھا جس کا ماضی سیاہ کاریوں سے بھرا پڑا تھا۔ کہتے ہی کہ بدا چھا بدنام برا۔ علی پوّا کا ماضی آسیب بن کر اس کا پیچھا کرتا رہا۔ جانکی اور علی پوّا کی قربت دیکھ کر اڑوسیوں پڑوسیوں کے دل و دماغ میں شک کے کیڑے کلبلانے لگے۔ محلے میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ اُڑتے اُڑتے یہ خبر ڈرائیوروں تک بھی پہونچ گئی۔ انہوں نے

www.urduacademyts.com

اس میں اپنی طرف سے نمک مرچ لگا کر اس طرح پیش کیا کہ جانکی کی شبیہہ ایک رنڈی سے بھی بدتر ہوکر رہ گئی۔ کاشی کے ناتے قرابت دار اس رشتے کو لے کر کافی دکھی اور پریشان تھے۔ محلے کی پنڈت برادری پیٹھ پیچھے کاشی کو تبرہ بھیجتے تھے مگر سامنے کوئی آنا نہیں چاہتا تھا۔ یہاں پر اُن کو اپنی عزت کی فکر ستانے لگتی تھی کیونکہ کاشی بڑا بدگو اور خردماغ تھا۔ اس کو چھیڑنا بھڑ کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے سے کم نہ تھا اس لئے مسلہ یہی بنا رہا کہ بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے۔ باتیں کرنا تو سب کو آتا ہے مگر جہاں قول و فعل کی بات ہو وہاں سب کنی کترانے لگتے ہیں

محلے میں آئے دن اسی بات کے چرچے ہوتے رہتے تھے پر کسی مائی کے لال میں علی پوا یا کاشی وسکی کو تنبیہہ کرنے کا یارا نہ تھا۔ اُن کی عدم موجودگی میں تو وہ ان کی جی بھر کے غیبت کرتے رہتے تھے مگر جونہی وہ سامنے آجایا کرتے تھے تو سبھوں کو جیسے سانپ سونگھ جاتا تھا۔ انہیں دیکھتے ہی ہر ایک کے منہ پر تالا پڑ جاتا تھا۔

ایک دن کاشی وسکی رات کو ہارٹ اٹیک سے مر گیا۔ صبح ہوتے ہوتے برادری کے لوگ جمع ہو گئے اور انہوں نے اپنی دیکھ ریکھ میں کاشی کا داہ سنسکار کرا دیا۔

جانکی پچھاڑیں کھا کھا کے رو رہی تھی، پر محلے کی عورتیں اس کی طرف ایسے دیکھ رہی تھیں جیسے کہہ رہی ہوں۔ آنسو ایک نہیں کلیجہ ٹوک ٹوک۔ جانکی کی دنیا اجاڑ اور ویران ہو چکی تھی پر سب کو یہی لگ رہا تھا جیسے یہ سب ڈھول کا پول ہو۔ کوئی اس کے رنج و غم کو سمجھ ہی نہیں پایا۔ انہیں اس کی ماتم داری ایک ڈھکوسلہ اور آنکھوں سے بہنے والے آنسو مگرمچھ کے آنسو لگ رہے تھے۔

اس شبہ کو اس وقت تقویت مل جاتی تھی جب علی پوا پاس پڑوسیوں اور رشتہ داروں کی موجودگی میں جانکی کی ڈھارس باندھنے لگتا تھا۔ یہ عالم دیکھ کر سب سے پہلے پڑوسیوں نے کھسکنا شروع کر دیا۔ اس کے بعد رشتہ دار بھی ایک ایک کر کے سرکنے لگے۔ لے دے کے گھر میں صرف دو ہی بندے رہ گئے۔ علی پوا اور جانکی۔ جانکی سر پر خاک ڈال کے بیٹھی تھی۔ اسے پتہ ہی نہیں چلا کہ تعزیت پرسی کے لئے آئے ہوئے لوگ اتنی جلدی چلے کیوں گئے۔

علی پوا اپنے استاد کے اسطرح چلے جانے سے بڑا دکھی اور اداس رہنے لگا۔ پہلے پوے سے تشفی ہوتی تھی۔ اب تو آدھی بوتل خالی کر کے بھی نشہ نہیں آتا تھا۔ جب بھی وہ بوتل کھول کے بیٹھ جاتا تھا تو سامنے کاشی وسکی بیٹھا ہوا ملتا تھا۔ اسے کاشی شدت سے یاد آ رہا تھا۔ وہ اسے لاکھ بھلانے کی کوشش کرتا تھا مگر وہ اسے بھلائے نہیں بھول رہا تھا۔ وہ جیسے اس کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ علی پوا اتنا سخت گیر اور بے رحم ہونے کے باوجود کبھی کبھی بچے کی طرح بلک بلک کر رونے لگتا تھا۔

کاشی وسکی کے چلے جانے کے بعد علی پوا نے جانکی کے یہاں ہی ڈیرہ ڈال دیا تھا۔ کل تک جو لوگ دبی زبان سے ان دونوں کے رشتے پر سوال اُٹھا رہے تھے اب وہی کھلے عام ان دونوں کے ناجائز رشتے پر حاشیہ چڑھانے لگے۔ ایک دن علی پوا رات کو جب پی پا کے جانکی کے گھر کی جانب بڑھ رہا تھا کہ کسی اندھیرے کونے میں ایک پنڈت لونڈے نے علی پوا اور جانکی کے ناجائز رشتے کے تعلق سے کوئی بات کہی۔ بس پھر کیا تھا۔ ایسا لگا جیسے محلے میں بھیانک طوفان آ گیا ہو۔ علی پوا نے ایسا

www.urduacademyts.com

ہنگامہ مچایا کہ محلے کے سبھی پنڈت گھروں میں دبک کر بیٹھے رہے۔ اس نے سڑک کے بلب توڑ دئے۔ گھروں کے شیشے پھوڑ دئے۔ اس کی زبان سے شعلے برس رہے تھے۔ وہ گندی گندی گالیاں دے کر محلے والوں کو للکار رہا تھا مگر کوئی مائی کالال باہر آ کر اس سے لوہا لینے کے لئے تیار نہ تھا۔ سبھی گونگے بہرے بنے بیٹھے رہے۔ جب وہ شانت نہ ہوا تو جانکی کو باہر آ کر اسے رام کرنا پڑا۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اندر تو لے آئی مگر اندر آ کر بھی وہ اپنی چونچ بند نہ رکھ سکا۔ وہ اچھل اچھل کر دشنام طرازی کرتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد جانکی نے اس کے سامنے کھانا رکھ دیا۔ پہلے تو اس نے کھانے سے انکار کر دیا لیکن جب وہ پیچھے پڑ گئی تو اس نے دو تین نوالے زہر مار کر کھا لئے۔

اس واقعے کے بعد جانکی کو کوئی بات اندر ہی اندر کھائے جانے لگی۔ محلے کے لوگ اس سے یوں دور دور بھاگتے تھے جیسے اسے چھوت کی بیماری لگی ہو۔ وہ کسی سے بات کرنا چاہتی تھی تو وہ ایسے کنی کاٹ کے نکل جاتا تھا جیسے اسے جانتا تک نہ ہو۔ ان کے اس رویے سے جانکی کا دل ریزہ ریزہ ہو کے رہ جاتا تھا۔ اس محلے میں اسے ایسا کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا جس کے پاس بیٹھ کر وہ اپنے دکھڑے روئے۔ لے دے کے ایک علی ہی تھا جو اصل میں اس سارے فساد کی جڑ تھا۔ اگر وہ اس سے بھی قطع تعلق کر دے تو پھر وہ کس کے سہارے جئے گی۔ کون اس کی خیر خبر لینے آئے گا۔ کل کو اگر وہ بیمار پڑ گئی تو کون اس کی سدھ لے گا۔

جانکی کو یہ غم اندر ہی اندر گھن کی طرح کھاتا رہا۔ وہ بڑی حساس اور خود دار عورت تھی۔ اسے ذلت و بدنامی کی اس زندگی سے عزت کی موت مرنا منظور تھا۔ آخر وہ ایسی زندگی جی کر کیا کرے جہاں اسے ہر پل رسوائی کی صلیب پر چڑھایا جائے۔ وہ کتنے دن اسی خلجان میں مبتلا رہی۔ آخر ایک دن اس نے بڑا بے رحم فیصلہ لیا۔ اس نے زہر کی شیشی میں اس سارے جھنجٹ سے چھٹکارہ پالیا۔ اگلے روز علی پوا جب جھومتے جھامتے گھر میں داخل ہوا تو جانکی کو بے سدھ پا کر وہ دھک سے رہ گیا۔

اس نے حواس یکجا کر کے جب جانکی کو ہلایا ڈھلایا تو اس کے بے جان جسم میں کوئی حرکت نہ ہوئی۔ اس کے حواس فاختہ ہوئے اور وہ شور مچاتے ہوئے پاس کی پولیس چوکی میں چلا گیا۔ پولیس ہبڑ دھبڑ میں اس کے ساتھ ہو لی اور انہوں نے لاش کو اپنی تحویل میں لے کر اسے پوسٹ مارٹم کے لئے بھیج دیا۔ پاس پڑوسی روزنوں اور کھڑکیوں کے درزوں سے تاکا جھانکی کرتے رہے مگر کوئی نیچے نہ آیا اور نہ ہی کسی نے از راہ انسانیت آگے بڑھ کر پرسان حال کیا۔ علی پوا تو سدھ بدھ بسرائے بیٹھا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ وہ کبھی گھر کے اندر بھاگتا تو کبھی پولیس اسٹیشن۔ اس پر عجب افتاد پڑی تھی۔ کوئی اُس کا ساتھ دینے کے لئے تیار نہ تھا۔

پوسٹ مارٹم ہونے کے بعد جانکی کے لواحقین کو خبر کر دی گئی مگر کوئی لاش لینے نہ آیا۔ دو دن تک لاش مردہ گھر میں پڑی رہی مگر کسی نے بھی تو وہ لینے کی کوشش نہ کی۔ بالآخر پولیس نے یہ لاش علی پوا کو سونپ دی۔ علی پوا یہ لاش لے کر جب محلے میں پہونچا تو آناً فاناً محلے میں سناٹا چھا گیا۔ لوگ اپنے گھروں میں یوں چھپ گئے جیسے باہر وبا پھیل گئی ہو۔ پہلی بار علی پوا نے کئی پڑوسیوں کے دروازے کھٹکھٹائے۔ انہیں خدا کے واسطے دئے،

www.urduacademyts.com

افسانہ

www.urduacademyts.com

غزلیں

صلاح الدین نیّر

ہر ایک ذرّہ بار امانت سے ڈر گیا
اک میں ہی تھا کہ تیرے مقابل ٹھہر گیا

دامن پہ بھیگی پلکوں کی تحریر چھوڑ کر
وہ شخص جاتے جاتے بھی احسان کر گیا

اس دور انتشار کا یہ بھی ہے حادثہ
تہذیب' زندہ رہ گئی' انسان مرگیا

میں اپنے گھر کے لوگوں میں رہتا تھا مطمئن
میرا وجود' آپ کی خاطر بکھر گیا

اُس وقت ہی سے خانہ بدوشوں کیساتھ ہوں
میں تم کو چھوڑتے ہوئے کب اپنے گھر گیا

وہ بھی کبھی تھا اپنے قبیلے کا آدمی
جو ہنستے ہنستے آیا تھا' باچشمِ تر' گیا

اب تک بھی جس کو چھونے کی نیّر ہے آرزو
وہ لمحۂ عزیز نہ جانے کدھر گیا

oOo

''کہکشاں'' 11-3-824/7
جدید ملے پلی'
حیدرآباد 001 500 (تلنگانہ)
موبائل : 9618334457

جلال عارفؔ

سال نو

سال نو آیا تو دل میں یہ خیال آیا ہے
پیشوائی کیلئے کیا کروں اور کیا نہ کروں
اس کے ہمرہ نئی سوغات ہے کیا میرے لیے
نئے خوابوں کو ملے گی نئی تعبیر بھی کیا
غم پیہم کی بدل جائے گی تصویر بھی کیا
ساتھ امید کے کتنے ہی خیال آتے ہیں
دل میں رہ رہ کے کئی ایک سوال آتے ہیں
خوف و دہشت کا وہ طوفان جو تھا پچھلے برس
ختم ہو گا کہ نہیں سلسلہ یہ اب کے برس
کس طرح لوگوں میں پھٹتے ہوئے بم کم ہوں گے
خوش رہیں گے سبھی یا دیدہ پرنم' ہوں گے
پوچھتے ہیں یہ زمیں دوز مکانوں کے کھنڈر
کب وہ دور آئے گا حالات منظم ہوں گے
ساتھ امید کے کتنے ہی خیال آتے ہیں
دل میں رہ رہ کے کئی ایک سوال آتے ہیں
خوش گمانی میری دیتی ہے تسلی مجھ کو
اب کے حالات نئے سال میں اچھے ہوں گے
رونے والے بھی نئے سال میں ہنستے ہوں گے
ہونا مایوس ہر اک غم کا مداوا ہوگا
حق نے چاہا تو نیا سال مسیحا ہوگا
نئی امیدیں لئے دن بھی نیا نکلا ہے
دور ذہنوں سے اندھیرا کہیں جا نکلا ہے
نئے منظر سے نیا حوصلہ پیدا ہوگا
اپنی منزل پہ بہر حال پہنچنا ہوگا

www.urduacademyts.com

غزلیں

صابرؔ کاغذنگری

جب بھی آفات کے طوفان اُٹھا کرتے ہیں
لوگ محفوظ رہیں ہم یہ دعا کرتے ہیں

کشتِ گل گشت میں بوتے ہیں وہ کانٹے لیکن
جانتے کچھ نہیں خود کا ہی بُرا کرتے ہیں

کُھل کے آجاتی ہے ایسوں کی ریاکاری بھی
جو دکھاوے کے لئے فرض ادا کرتے ہیں

مندمل ہونے کو آتے ہیں پُرانے منظر
لوگ یادوں کا نیا زخم ہرا کرتے ہیں

فتنہ گر نت نئے حربوں کا سہارا لے کر
روز و شب دہر میں کہرام بپا کرتے ہیں

ہم سے تاریخ کے اوراق ہیں روشن لیکن
ہم کو بھی لوگ سیہ کار کیا کرتے ہیں

وقت و حالات کو رکھتے ہیں سدا پیش نظر
اہل فن، اہل سخن فکرِ رسا کرتے ہیں

ہم بھی کچھ علمِ قیافہ کی شناسائی سے
بھیڑ میں لوگوں کے چہروں کو پڑھا کرتے ہیں

بے ضمیروں کا یہ معمول رہا ہے صابرؔ
شہرتوں کے لیے بے مول بکا کرتے ہیں

oOo

''کاشانہ صابر'' 1-3-35/B
نزد قدیم ریلوے گیٹ، سنجیویا کالونی، سرپور کاغذنگر۔ 504 296
موبائل : 9441020768

ڈاکٹر معید جاویدؔ

سال بدلا ہے، حال بدلے گا
یہ زمانے کی چال بدلے گا

دیکھ مجھ کو نہ پھاڑ کر آنکھیں
تیرا خواب و خیال بدلے گا

وہ نہ بدلے گا اپنی خو ہرگز
وہ شکاری ہے، جال بدلے گا

وقت کا دیکھئے تو یہ جادو
دن جو گزریں گے سال بدلے گا

مجھ کو اُلجھا دیا نصیبوں نے
رب ہی میرا زوال بدلے گا

اس کو دولت کا ہوگیا نشّہ
ہے یقیں چال ڈھال بدلے گا

وہ ہے دیوانہ اس لیے جاویدؔ
ہر گھڑی حال قال بدلے گا

oOo

مکان نمبر 1-4-256/1 شربتی کنال
بودھن، ضلع نظام آباد 503185 (تلنگانہ)
موبائل: 9849535693

www.urduacademyts.com

غزلیں

فرید سحرؔ

نئے سال کی مسرت میں

(مزاحیہ)

ہم بھی غزل کو گائیں گے یارو نئے برس
رنگ اپنا ہم جمائیں گے یارو نئے برس
ڈفلی نئی بجائیں گے یارو نئے برس
کرتب بھی ہم دکھائیں گے یارو نئے برس
ایکٹنگ ہماری دیکھنے اسٹیج پر یہاں
مُردے بھی اُٹھ کے آئیں گے یارو نئے برس
گھپلے، گھٹالے دیش میں کوئی کرے اگر
اس کی چتا جلائیں گے یارو نئے برس
محفل کو لُوٹنے کے لئے ہم کلام بھی
اُستاد کا سُنائیں گے یارو نئے برس
ہندی میں اک لکھیں گے گجل اور کسم سے پھر
اُردو میں ہم سُنائیں گے یارو نئے برس
مانگے جو گھوڑے جوڑے میں لاکھوں روپے اگر
مُرغا اُسے بنائیں گے یارو نئے برس
برسوں سے پڑھ رہے ہیں فقط جس غزل کو ہم
پُورا برس چلائیں گے یارو نئے برس
کل تک تو صرف سُنتے رہے اُن کی ہم سحر
اب اُن کا بھیجہ کھائیں گے یارو نئے برس

oOo

حیدرآباد (تلنگانہ، انڈیا)

جہانگیر قیاسؔ

ہونے کو آتا ہے اکثر رات میں
حملہ آور غم کا لشکر رات میں
سونے دیتی ہی نہیں فکرِ سخن
غزلیں لکھتا ہے سخنور رات میں
میری آنکھوں میں اُبھر کر آگیا
خوبصورت اُس کا پیکر رات میں
خواب دن میں دیکھے جاتے جو نہیں
خواب آتے ہیں اکثر وہ رات میں
چاندنی راتوں میں جب پیتے ہیں لوگ
''چاند بن جاتا ہے ساغر رات میں''
دن میں تو رہتے ہیں شرمائے ہوئے
بات کرتے ہے وہ کھُل کر رات میں
یاد اُس کی دیتی ہے دستک قیاسؔ
دل کے دروازے پہ اکثر رات میں

oOo

ڈائریکٹر/سکریٹری تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی ڈاکٹر محمد غوث' اردو اکیڈیمی کے زیر اہتمام ''ایک شام شعر و ادب کے نام'' کے عنوان سے سنجیدہ و مزاحیہ مشاعرہ تقریب سے صدارتی خطاب کرتے ہوئے۔ اس موقع پر لی گئی تصویر میں مہمان خصوصی ڈاکٹر محمد رحیم الدین انصاری سابق صدر نشین تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی و مہمان اعزازی ممتاز انشاء پرداز ڈاکٹر عابد معز' مسٹروی کرشنا سپرنٹنڈنٹ اردو اکیڈیمی کے علاوہ ممتاز شعرائے کرام جناب صلاح الدین نیر' جناب جلال عارف' ڈاکٹر محسن جلگانوی' جناب سید مسرور عابدی' ڈاکٹر فاروق شکیل' جناب سردار سلیم' جناب قاضی فاروق عارفی' ڈاکٹر طیب پاشاہ قادری' جناب ظفر فاروقی' جناب شاہد عدیلی' جناب وحید پاشاہ قادری' جناب فرید سحر' جناب جمیل نظام آبادی جناب مسعود مرزا محشر (ورنگل) جناب حلیم بابر (محبوب نگر) جناب صابر کاغذنگری' جناب چچا پالموری (محبوب نگر) جناب حسنین علی باقر (نلگنڈہ) و دیگر اصحاب دیکھے جاسکتے ہیں

تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی کے زیر اہتمام ''ایک شام شعر و ادب کے نام'' کے عنوان سے سنجیدہ و مزاحیہ مشاعرہ کے موقع پر اکیڈیمی کے زیر اہتمام بچوں کا ماہنامہ ''روشن ستارے'' ذہنی ورزش کالم کے انعام یافتگان کو مہمان خصوصی ڈاکٹر محمد رحیم الدین انصاری سابق صدر نشین تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی کے ہاتھوں انعامات سے نوازا گیا۔ اس موقع پر لی گئی تصویر میں ڈائریکٹر/سکریٹری تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی ڈاکٹر محمد غوث' شعرائے کرام و دیگر اصحاب دیکھے جاسکتے ہیں۔

ممتاز محقق' ادیب' شاعر' نقاد سفیر اردو زبان ڈاکٹر سید تقی عابدی حال مقیم کینڈا' صدر دفتر تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی میں منعقدہ تہنیتی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے۔ تصویر میں ڈاکٹر محمد غوث ڈائرکٹر/سکریٹری تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی' پروفیسر مجید بیدار سابق صدر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی' قاری محمد نصیر الدین منشاوی' مسٹروی۔ کرشنا سپرنٹنڈنٹ' شیخ اسمٰعیل' محمد عطا اللہ خان' محمد ارشد مبین زبیری' سردار سلیم' محمد اسمٰعیل جاوید' رجب علی پاشاہ و دیگر معززین دیکھے جاسکتے ہیں۔

Urdu Monthly

Qaumi Zaban

AN OFFICIAL ORGAN OF TELANGANA STATE URDU ACADEMY | Vol. 07 | No. 01 | January 2022

RNI Regn. No. : TELURD/2015/32622
Date of Publication : 15th of every month

RNP No. H-HD-GPO/059/2020-2022
Posting Date : 18th, 19th and 20th of every month

Accredited under the
University Grants Commission (UGC) Care-List

جناب کوپّولہ ایشور عزت مآب وزیر برائے درج فہرست طبقات، اقلیتی بہبود، بہبودی معمرین ومعزورین حکومت تلنگانہ نے تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی کی اسکیمات کے لئے درخواستوں کے آن لائن ادخال کے سلسلہ میں جاری لنکس کا افتتاح کیا۔ اس موقع پر لی گئی تصویر میں ڈاکٹر محمد غوث ڈائرکٹر/ سکریٹری تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی، مسٹروی۔ کرشنا سپرنٹنڈنٹ اردو اکیڈیمی، شیخ اسمٰعیل، محمد عطا اللہ خان، محمد ارشد مبین زبیری، محمد جنید اللہ بیگ، رجب علی پاشاہ و دیگر اصحاب دیکھے جاسکتے ہیں

Regd. Office : Telangana State Urdu Academy,
4th Floor, Haj House, Nampally, Hyderabad - 500 001 T.S. (India)
Phone : 91-04-23237810, Fax : 040-66362931 Email: qaumizaban.tsua2015@gmail.com
ISO 9001 : 2015 Certified Organisation Website: www.urduacademyts.com